قرآنِ حکیم ہم سے کیا چاہتا ہے؟

ڈاکٹر اسرار احمد

انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی (رجسٹرڈ)

قرآن اکیڈمی' خیابانِ راحت' درخشاں' ڈیفنس فیز VI ' کراچی

فون نمبر: 23 - 5340022 ' فیکس: 5840009

ای میل: karachi@quranacademy.com

ویب سائیٹ: www.quranacademy.com

نام کتاب ——— قرآن حکیم ہم سے کیا چاہتا ہے؟

طبع اوّل (نومبر 2004ء) ——— 6000

زیرِ اہتمام ——— انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی

قیمت ——— -/40 روپے

کراچی میں لائبریریز اور مکتبہ جات کے پتے

1- قرآن اکیڈمی ' خیابان راحت' درخشاں ' فیز 6 ' ڈیفنس فون: 23-5340022

ای میل: karachi@quranacademy.com

2- 11– داؤد منزل نزد فریسکو سویٹ' آرام باغ فون: 2216586 - 2620496

3- حق اسکوائر عقب اشفاق میموریل ہسپتال بلاک 13-C ' گلشنِ اقبال فون: 65-4993464

4 - دوسری منزل، حق چیمبر، بالمقابل بسم اللہ تقی ہسپتال، کراچی ایڈمنسٹریشن سوسائٹی فون: 4382640

5- قرآن مرکز نزد مسجد طیبہ، سیکٹر 35/A، زمان ٹاؤن، کورنگی نمبر 4 فون: 5078600

6- فلیٹ نمبر 2، محمدی منزل بلاک ''K''، ناظم آباد فون: 6674474

7- C-113، مادام اپارٹمنٹس، شارع فیصل' نزد ڈرگ روڈ گیٹ' ایئرپورٹ' فون: 4591442

8- قرآن اکیڈمی لیٰسین آباد، فیڈرل بی ایریا بلاک 9 فون: 6337361

9- متصل محمدی آٹوز، اسلام چوک، سیکٹر 11/2، اورنگی ٹاؤن فون: 66901440

10- قرآن مرکز لانڈھی، مکان نمبر 861 سیکٹر 37-D، لانڈھی نمبر 2، نزد رضوان سویٹس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست

1	قرآنِ حکیم کا پہلا تقاضا -- عبادتِ ربّ	5
2	قرآنِ حکیم کا دوسرا تقاضا -- شہادت علی الناس	28
3	قرآنِ حکیم کا تیسرا تقاضا -- اقامتِ دین	47

قرآنِ حکیم کا پہلا تقاضا -- عبادتِ ربّ

تمام انسانوں سے قرآنِ حکیم کا پہلا تقاضا ہے ''عبادتِ رب''۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿﴾

''اے لوگو! عبادت کرو اُس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور اُن کو بھی جو تم سے پہلے گزرے تاکہ تم بچ سکو۔'' (البقرہ : 21)

آیت کا محل و مقام :

اِس آیہ مبارکہ پر غور و تدبر سے پہلے ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم میں اِس آیت کے مقام کو سمجھ لیا جائے۔ قرآنِ حکیم میں سب سے پہلی سورۃ، سورۃ الفاتحہ ہے۔ یہ سورۃ بالکل اِسی طرح ہے جیسے کسی کتاب میں دیباچہ یا مقدمہ ہوتا ہے۔ اِس سورۃ میں مسلمانوں کو یہ دعا تلقین کی گئی کہ :

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿﴾ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ە
غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴿﴾

''پروردگارا! ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔ ان بندوں کی راہ پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ تو تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔''

اِس دعا پر سورۃ الفاتحہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اِس کے بعد پورا قرآنِ حکیم اِس دعا کا جواب ہے۔ گویا قرآنِ حکیم ہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کا ایک بندہ مومن محتاج ہے۔ یہی اُن لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا، جو نہ گمراہ ہوئے اور نہ اُن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِسی دعا کا مفصل جواب پورے قرآنِ حکیم میں بالعموم اور پہلی چار طویل مدنی سورتوں (البقرۃ، آلِ عمران، النساء، المائدہ) میں بالخصوص پھیلا ہوا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ البقرۃ شروع ہوتی ہے۔ اِس سورۂ مبارکہ کے پہلے دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ ایک وہ جو قرآنِ حکیم سے ہدایت حاصل

کریں گے۔ اِن کے ذکر میں وہ شرائط بیان کردی گئی ہیں جو قرآنِ حکیم سے صحیح استفادہ کے لئے ضروری اور لازمی ہیں۔ دوسرے وہ جو کفر پر ضد کے ساتھ اڑ چکے ہیں۔ اُن میں ہدایت کی طلب ہی سرے سے باقی نہیں رہی، لہٰذا اُن کے لئے قرآنِ حکیم سے رہنمائی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ پھر دوسرے رکوع میں انسانوں کی تیسری قسم کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے جو ان پہلی دو قسموں کے بین بین ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو مان لیتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ دوسرا رکوع پورے کا پورا انہی لوگوں سے متعلق تفصیلات، اِن کی کیفیات اور اِن کے اوصاف پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد تیسرے رکوع میں قرآنِ حکیم تمام انسانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتا ہے جس کا آغاز آیت 21 سے ہوتا ہے کہ :

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾

"اے لوگو! عبادت کرو اُس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور اُن کو بھی جو تم سے پہلے گزرے تاکہ تم بچ سکو۔"

قرآنِ حکیم کی دعوت:

اِس آیت میں ایک ہی جملہ میں قرآنِ حکیم کی دعوت کا خلاصہ بیان کردیا گیا ہے۔ اگر یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ قرآنِ حکیم انسانوں کو کس بات کی طرف بلاتا ہے تو اس کے لئے یہ ایک جملہ ہی کفایت کرے گا۔ آیئے اس آیہ مبارکہ پر غور کرتے ہیں:

اس آیتِ مبارکہ کا آغاز "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ "یٰۤاَیُّهَا" کلمۂ ندا ہے جو پکارنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ" کا مطلب ہوا اے لوگو! دعوت کے اس انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم محض بے بنیاد اور بے دلیل عقائد پر مشتمل کوئی کتاب نہیں بلکہ ایک واضح دعوتِ عمل ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کسی قوم، طبقے، نسل، قبیلہ یا رنگ کے انسانوں یا کسی ایک ملک کے رہنے والوں کو نہیں پکارتا بلکہ پوری نوعِ انسانی کو پکارتا ہے۔ اس کی دعوت زمان و مکان سے آزاد ہے اور قیامت تک آنے والے انسان اس کے مخاطب ہیں۔

دعوت میں آفاقیت :

یہاں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم ﷺ سے قبل جتنے بھی نبی اور رسول آ ئے، اُن کی دعوت صرف اپنی اپنی قوم کے لئے تھی ۔قرآنِ حکیم میں کئی رسولوں کی دعوت نقل کی گئی جس کا آغاز" یٰـقَـوْمِ "(اے میری قوم کے لوگو!) سے ہوتا ہے ۔آپ ﷺ سے قبل آخری رسول حضرت عیسیٰؑ تھے جن کے بارے میں قرآنِ حکیم میں ''رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ '' (بنی اسرائیل کی طرف رسول) کے الفاظ آئے ہیں ۔انجیل میں آپ کے یہ الفاظ ملتے ہیں: ''میں اسرائیل کے گھرانے کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں''۔گویا آپؑ کی دعوت کے اصل مخاطب بنی اسرائیل تھے ۔آپؑ کے بعد عیسائیت نے ایک تبلیغی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی ۔صرف آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں جن کی دعوت کے لئے قرآنِ حکیم میں ''یٰقَوْمِ'' کی بجائے ''یٰٓاَیُّھَا النَّاس'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ گویا آپ ﷺ واحد رسول ہیں جن کی دعوت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔

مذاہب کی دنیا سے علیحدہ ہٹ کر بھی سوچا جائے تو اس وقت دنیا میں مختلف نظریات کی حامل بے شمار دعوتیں موجود ہیں لیکن اِن میں سے کوئی ایک دعوت بھی ایسی نہیں ہے جس میں پوری نوعِ انسانی کو بحیثیت ایک اکائی پکارا جاتا ہو۔پچھلی صدی میں جو دعوت قومی وجغرافیائی سطح سے کچھ بلند ہوئی وہ اشتراکیت کی دعوت ہے، لیکن اس میں بھی پکار یہ ہے کہ'' دنیا بھر کے مزدورو اور کسانو، متحد ہو جاؤ!''۔یعنی یہ دعوت دنیا بھر کے انسانوں کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف کسانوں اور محنت کشوں پر مشتمل ایک مخصوص طبقے کے لئے ہے۔اِس دعوت میں سوسائٹی کو طبقات میں تقسیم کر کے ایک خاص طبقے کی حمایت کا اعلان کیا جاتا ہے اور دوسرے طبقوں کو قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے ۔صرف قرآنِ حکیم کی دعوت ہی عالمگیر اور آفاقی حیثیت کی حامل دعوت ہے!۔یہی ایک ایسی دعوت ہے جس کا خطاب ہر انسان سے ہے خواہ وہ امیر ہو یا غریب اور خواہ اُس کا تعلق کسی ملک، نسل اور زبان سے ہو۔

قرآنِ حکیم کی اصل دعوت ......"عبادتِ رب" :

اب اگلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی دعوت اصل میں ہے کیا؟ یعنی قرآنِ حکیم کس کام کے لئے بلاتا ہے۔ اس بات کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا :

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ

"اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی!"

گویا قرآنِ حکیم کی دعوت ہے "عبادتِ رب"۔ قرآنِ حکیم کی پوری دعوت کا خلاصہ یہی ہے کہ : "اپنے رب کی عبادت کرو!"۔ سورۂ ھود کے آغاز میں فرمایا گیا :

کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ﴿۱﴾
اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ ﴿۲﴾

"یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئی ہیں (خوب جانچ لی گئی ہیں) پھر ان ہی کی تفصیل وشرح کی گئی ہے ایک حکمت والی اور باخبر ہستی کی طرف سے۔ (یہ کتاب جو پیغام لے کر آئی ہے وہ یہ ہے کہ) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یقیناً میں تمہارے لئے اس ہستی کی طرف سے نذیر اور بشیر بن کر آیا ہوں۔"

یعنی اگر اس دعوت سے اعراض کرو گے، اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرو گے یا عبادت میں اُس کے ساتھ کسی اور کو شریک کرو گے تو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے خبردار کرنے آیا ہوں اور اگر اسی کی عبادت کرو گے تو میں تم کو ہمیشہ ہمیش کی نعمتوں کی خوش خبری سنانے آیا ہوں۔

سورۂ ذاریات کی آیت 56 میں عبادتِ رب کو انسانوں اور جنوں کا مقصدِ تخلیق قرار دیا گیا :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

"میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں بنایا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔"

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

تمام انبیاءؑ ورسلؑ کی مشترک دعوت :

اصولی بات یہ سمجھ لینے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے لے کر آخری نبی حضرت محمد ﷺ تک جتنے بھی انبیاء اور رسول بھیجے وہ یہی ''عبادتِ رب'' کی دعوت لے کر آئے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اپنی عبادت مقرر فرمایا لہٰذا یہ لازم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول نوعِ انسانی کو اپنی تخلیق کا مقصد پورا کرنے کی دعوت دیں۔ انہیں بتائیں کہ اگر انہوں نے اپنی تخلیق کا مقصد پورا نہ کیا تو وہ دنیا میں بھی ناکام رہیں گے اور آخرت میں بھی ہمیشہ ہمیش کے عذاب کے حوالہ کر دیے جائیں گے۔

سورۂ اعراف، سورۂ ھودؑ، سورۂ مومنون، سورۂ شعراء اور متعدد مکی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاء اور رسولوںؑ کا نام بنام ذکر فرمایا اور وضاحت فرمائی کہ وہ ''عبادتِ رب'' کی دعوت لے کر اپنی اپنی قوموں کی طرف آئے تھے۔ سورۂ اعراف اور سورۂ ھود میں تو ہر رسول کی دعوت کی ابتداء کے لئے یہی کلمات نقل کیے گئے ہیں :

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے!''

''عبادت'' — قرآنِ حکیم کی ایک بنیادی اصطلاح :

مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ ''عبادتِ رب'' قرآنِ حکیم کی بڑی ہی بنیادی اور مرکزی اصطلاح ہے اور پورے قرآنِ حکیم کی دعوت کا خلاصہ اسی ایک لفظ ''عبادت'' میں بیان کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم کی دعوت کا فہم اسی لفظ ''عبادت'' کے صحیح فہم پر منحصر ہے اور اسی سے تمام انبیاء اور رسولوںؑ کی اس متفقہ دعوت کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ عبادتِ رب کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے قرآنِ حکیم کے متعدد مقامات سے مدد لی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ البینہ کی آیت 5 کا مطالعہ فرمایئے :

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا

الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ﴿۵﴾

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں، اپنی اطاعت کو صرف اُسی کے لئے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یہی (طرزِ عمل) ہے بالکل سیدھا دین۔"

اس آیہ مبارکہ کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے دو باتیں نوٹ فرمالیں۔

i- اس سورۂ مبارکہ کا نام ہے "البیـــــنۃ"، جس کے معنی ہیں "روشن اور واضح دلیل"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سورۂ مبارکہ کے مضامین روزِ روشن کی طرح عیاں اور سورج کی طرح تابناک ہیں۔ جس طرح "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کے مصداق سورج کے وجود کے لئے کسی خارجی دلیل کی حاجت نہیں، اسی طرح اس سورۃ کے مضامین خود اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

ii- سورۃ البینہ کی آیات 1 تا 4 سے اس آیہ مبارکہ کا ربط وتعلق یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکین اپنے کفر اور گمراہی میں اتنا آگے نکل گئے تھے کہ اُن کے لئے اپنی تحریف شدہ کتابوں یا خود اپنی عقل سے راہِ ہدایت پانا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رسول اُن کے پاس واضح دلیل کے ساتھ بھیجا جائے، جو اُن کے سامنے پچھلی تمام کتابوں کی اصل دعوت کو پھر سے پیش کرے۔

سورۂ مبارکہ کی ابتدائی آیات میں اس پس منظر میں نبی اکرم ﷺ کی آمد کا مقصد بیان کیا گیا۔ پھر بتایا گیا کہ اِن کافروں کا حق سے اعراض اس لئے نہیں تھا کہ ان تک صحیح علم نہیں پہنچا تھا، بلکہ واضح دلیل آجانے کے بعد اُن کی بد اعمالیاں محض خواہشاتِ نفس کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کا ہر نبی اور رسول عبادتِ رب کی دعوت لے کر آتا تھا۔ لہٰذا انہیں اس کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں یکسو ہو کر، اپنی اطاعت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور یہی اصل

دین ہے!

غور طلب بات یہ ہے کہ اِس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا علیحدہ حکم ہے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا علیحدہ۔ گویا عبادت سے مراد صرف عبادات نہیں بلکہ عبادات کا علیحدہ سے کوئی خاص مفہوم ہے۔

''عبادت'' کا لغوی مفہوم:

لغوی اعتبار سے لفظ ''عبادت'' کا مفہوم کسی کے سامنے جھک جانا، پست ہوجانا اور بالکل بچھ جانا ہے۔ اِسی لئے عربی میں ''اَلطَّرِیْقُ الْمُعَبَّدُ'' اس راستے کو کہتے ہیں جو مسلسل چلتے رہنے کی وجہ سے خوب پامال ہوکر بالکل ہموار ہوگیا ہو اور اس میں کوئی اونچائی نیچائی نہ رہی ہو۔ اسی طرح اگر کسی جانور کو خوب سدھا لیا جائے کہ وہ اپنے مالک کا ہر حکم ماننے لگے، محض اشارے یا لگام کی ذرا سی حرکت سے وہ سمجھ لے کہ میرا مالک کیا چاہتا ہے، مجھے کس طرف مڑنا چاہیئے، مجھے اپنی رفتار تیز کرنی چاہیئے یا ہلکی رکھنی چاہیئے تو اس کے لئے بھی عربی میں یہی لفظ ''مُعَبَّدٌ'' استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ''اَلْبَعِیْرُ الْمُعَبَّدُ'' اُس اونٹ کو کہتے ہیں جسے خوب سدھا لیا گیا ہو اور جو پورے طور پر اپنے مالک کے اشاروں پر حرکت کرنے لگا ہو۔ ابوحیان اندلسی نے لکھا ہے کہ ''اَلْعِبَادَۃُ --اَلتَّذَلُّلُ ..... قَالَہُ الْجَمْھُوْرُ'' یعنی اِس پر تقریباً اجماع ہے کہ عبادت کا اصل مفہوم ''تذلل'' یعنی کسی کے سامنے پست ہوجانا، کسی کے سامنے جھک جانا یا کسی کے سامنے بچھ جانا ہے۔ چنانچہ کسی کا فرمانبردار ہوجانا اور خود کو اس کے سامنے بچھا دینا اصل میں عبادت ہے۔

بعض اوقات کسی کی اطاعت مجبوری کے تحت اور اپنی مرضی کے خلاف بھی ہوسکتی ہے۔ ایسی اطاعت پر بھی اِس لفظ عبادت کا اطلاق ہوگا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے مصر میں بنی اسرائیل کی محکومی اور اطاعت کی جو کیفیت بیان کی ہے کہ فرعون اور اُس کی قوم نے اُن کو اپنا غلام بنا رکھا تھا تو اِس مفہوم کی تعبیر کے لئے یہی لفظ ''عبادت'' استعمال کیا گیا ہے۔ سورہ شعراء آیت 22

میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول نقل ہوا ہے جو انہوں نے فرعون سے مخاطب ہوکر کہا تھا :

اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

''تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنالیا ہے!''

پھر یہی لفظ ایک موقع پر خود فرعون نے بھی استعمال کیا۔سورۃ مومنون آیت **47** میں بیان ہوا کہ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے فرعون اور اُس کے سرداروں کو عبادت رب کی دعوت دی تو اُنہوں نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا کہ ہم اِن کی بات مانیں حالانکہ :

وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿﴾

''اور اِن دونوں کی قوم ہماری غلام ہے۔''

گویا لغوی اعتبار سے عبادت کا لفظ اطاعت کے لئے آتا ہے، چاہے اِس میں اطاعت کرنے والے کی اپنی مرضی اور خواہش کا دخل نہ بھی ہو۔یہی وجہ ہے عربی میں غلام کو''عبد'' کہتے ہیں جسے مجبوراً اپنے آقا کی ہر وقت اور ہر معاملہ میں اطاعت کرنا پڑتی تھی۔فارسی میں غلام کو ''بندہ'' کہتے ہیں،لہٰذا عبادت کے لغوی مفہوم کے لئے مناسب لفظ ہے''بندگی''۔

''عبادت'' کا اصطلاحی مفہوم :

لفظ''عبادت''جب اپنی لغوی اصل سے اُٹھ کر ہمارے دین کی اصطلاح بنتا ہے تو ''اطاعت'' کے ساتھ ساتھ اس میں ایک دوسرا جزو لازماً شامل ہوجاتا ہے اور وہ ہے''محبت''۔لہٰذا عبادت کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ شوق اور محبت کے جذبے کے ساتھ کسی کے سامنے اپنے آپ کو بچھا دینا۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس لفظ کی تعریف اس طرح کی ہے :

لَفْظُ الْعُبُوْدِیَّةِ یَتَضَمَّنُ کَمَالَ الذُّلِّ وَکَمَالَ الْحُبِّ

''عبودیت کا لفظ حد درجہ بچھ جانے اور حد درجہ محبت کرنے پر مشتمل ہے۔''

گویا عبادت یہ ہے کہ انسان خود اپنی مرضی سے پوری طرح اللہ کی مرضی کے حق میں دست بردار ہوگیا ہو اور اُس کا اللہ کے سامنے یہ جھکنا دل کی پوری آمادگی اور رغبت کے ساتھ

ہو۔ امام ابن قیمؒ نے عبادت کو ان الفاظ میں مزید واضح کیا ہے :

اَلْعِبَادَةُ تَجْمَعُ اَصْلَيْنِ : غَايَةُ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ

''عبادت دو چیزوں کو جمع کرتی ہے ایک انتہائی محبت اور دوسرے انتہائی عاجزی کے ساتھ پست ہو جانا۔''

عبادت کا جسم ہے اللہ کی کلی اطاعت اور اس کی روح ہے محبت۔ عبادت کا یہ اصطلاحی مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب قرآنِ حکیم کی دعوتِ عبادت پر دوبارہ توجہ مرتکز کیجئے۔ ''یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ '' کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے انسانو! جھک جاؤ، اپنے آپ کو بچھا دو... کمالِ محبت اور کمالِ شوق و رغبت کے ساتھ..... اُس ہستی کے سامنے جو تمہارا رب یعنی پالنے والا ہے اور تمہارا خالق بھی ہے۔

''عبادت'' کا محدود تصور :

عبادت کے اِس حقیقی مفہوم کو ذہن میں رکھ کر سوچئے کہ ہمارے ہاں اس لفظ عبادت کا حلیہ کس طرح بگڑا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں دینی تصورات جس طرح محدود اور بعض حلقوں میں جس قدر مسخ ہو چکے ہیں، اس کا نمایاں مظہر یہ ہے کہ ہم نے ''عبادت'' کو صرف چند اعمال اور عبادات کے ساتھ مخصوص کر لیا ہے۔ ان ہی کی ادائیگی پر عبادت کو منحصر سمجھ لیا ہے۔ عوام الناس کے ذہنوں میں عبادت کا یہ تصور راسخ ہو گیا ہے کہ عبادت سے مراد ہے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ بلاشبہ یہ سب عبادات ہیں، لیکن جب عبادت کو انہی میں منحصر کر لیا جائے گا اور یہ سمجھ لیا جائے گا کہ بس ان کو ادا کرنے سے عبادت کا حق ادا ہو گیا تو تصورِ دین محدود (**Limited**) ہی نہیں، مسخ (**Perverted**) ہو جائے گا۔ یہ تصور اس وقت تک صحیح اور درست نہیں ہوگا جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عبادت پوری زندگی میں اللہ کے سامنے بچھ جانے کا نام ہے۔ عبادت اِس طرزِ عمل کا نام ہے کہ کمالِ محبت و شوق اور دل کی پوری آمادگی کے ساتھ زندگی کے ہر معاملہ اور ہر گوشہ میں اللہ کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ اپنی آزادی، اپنی خود مختاری، اپنی مرضی، اپنی

چاہت اور اپنی پسند کو اللہ کی مرضی اور رضا کا تابع بنا دیا جائے۔ زندگی کے تمام افعال و اعمال میں "سر تسلیم خم ہے ......" کا رویہ اختیار کرنا اور پوری زندگی کا اس رخ پر ڈھل جانا ہی عبادت ہے۔

ایک وسیع تر لیکن ناقص تصورِ عبادت:

خوش قسمتی سے اس دور میں عبادت کا ایک وسیع تر تصور عام ہو رہا ہے اور بہت سے اہلِ قلم حضرات کی کاوشوں اور کوششوں کے نتیجہ میں اب یہ بات پڑھے لکھے طبقہ کی اچھی خاصی تعداد کے سامنے واضح ہو چکی ہے کہ پوری زندگی میں اللہ کے حکم کو ماننا اور زندگی کے تمام گوشوں میں اُس کے قانون کی اطاعت کرنا عبادت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس طبقہ کے تصورِ عبادت میں بھی ایک محدودیت موجود ہے اور وہ یہ کہ ان کے ہاں عبادت کے ایک جزو یعنی کامل اطاعت پر تو پورا زور موجود ہے لیکن اس کا دوسرا جزو اور عبادت کی روح یعنی کمالِ شوق، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذاتی محبت اور دل کی پوری آمادگی نگاہوں سے اوجھل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت کی اس روح کے بغیر اطاعت کو اگر پوری زندگی پر بھی پھیلا دیا گیا ہو، تو بھی عبادت کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اس کے لئے کامل اطاعت کے ساتھ ساتھ اللہ کے ساتھ دلی لگاؤ اور شوق و رغبت بھی لازمی ہے، بقول علامہ اقبال:

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

عبادت کی روحِ حقیقی: محبتِ الٰہی:

عبادت کی روحِ حقیقی محبتِ خداوندی کو قرآنِ حکیم میں بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اسے ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ: 165)

"اور جو لوگ ایمان لائے وہ سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے ہیں"

اس آیت کے پہلے حصے میں فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ

''اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو اس کا مدِ مقابل بنا لیا ہے

اور وہ اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنی چاہیئے''۔

''کَحُبِّ اللّٰهِ'' کا مفہوم ہے اللہ کی محبت کی طرح۔ اگر ہم غور کریں تو ہماری کیفیت اس سے بھی بدتر ہے، کیونکہ ہم نے اللہ کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں اور نظریات کو اللہ جیسا نہیں بلکہ اللہ سے بھی زیادہ محبوب بنالیا ہے۔ ہم نے دنیوی محبتوں کو اللہ کی محبت پر غالب کر دیا ہے۔ ہماری کیفیت تو وہ ہے جو سورہ توبہ کی آیت 24 میں بیان ہوئی کہ :

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

''کہہ دیجئے (اے نبی ﷺ) اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں خسارے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں۔ اگر تمہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ اپنا فیصلہ (یعنی تمہاری موت) اور اللہ ایسے نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

اس آیہ مبارکہ میں فی الواقع ہماری تصویر موجود ہے۔ سورہ انبیاء آیت 10 میں قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا گیا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ('' اس قرآن میں تمہارا ذکر موجود ہے'')۔ چنانچہ ہر شخص قرآن کے اس ابدی و دائمی آئینہ میں اپنی سیرت کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ اس وقت اکثر و بیشتر ہمارا جو حال ہے وہ سورہ توبہ کی آیت 24 میں بیان کر دیا گیا۔ اس کے برعکس ہونا یہ

چاہیئے کہ صرف اللہ کی نہیں بلکہ اُس کے رسول ﷺ کی محبت بھی تمام رشتوں اور اسباب کی محبتوں پر غالب ہو کیونکہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اُس کے لئے اس کے بیٹے، اُس کے والد اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔“ (مسلم)

الحمدللہ ! قرآن و حدیث کی روشنی میں ”عبادتِ رب“ کا حقیقی مفہوم ہم پر واضح ہو گیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ”عبادتِ رب“ کے اِس تصور کو عام کیا جائے۔ جن حضرات کے ذہنوں میں یہ تصور واضح ہو جائے وہ اِسے مزید آگے پھیلائیں اور عوام الناس کو آگاہ کریں کہ عبادت سے محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ مراد لے لینا اور باقی زندگی کو اس سے خارج سمجھنا عبادت کا بڑا ہی غلط تصور ہے۔ عبادت تو اصلاً یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر پوری زندگی اللہ کی اطاعت میں بسر ہو اور زندگی کا کوئی گوشہ اِس سے آزاد نہ رہے۔ نہ صرف یہ کہ ہماری گھر کی زندگی اور بازار کی زندگی اللہ کی کامل اطاعت کا نمونہ نظر آئے، بلکہ قومی اور ریاستی سطح کے تمام ادارے اور حکومت کے تمام شعبے جب تک قانونِ خداوندی کے پابند نہ ہو جائیں، اِس وقت تک عبادت کا حقیقی تقاضا ادا نہیں ہوتا اور اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (”اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ“ ، البقرۃ : 208) کے قرآنی حکم کی تعمیل نہیں ہوتی۔ اس کے بعد اِس بات کو بھی اچھی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ صرف اطاعت نہیں بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہے جس میں اللہ کے ساتھ ایک ذاتی تعلق اور ذاتی محبت کا رشتہ موجود ہو۔ اگر یہ نہیں تو عبادت ایک بے روح ڈھانچہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ہر عمل لذت کی چاشنی سے محروم ہو جاتا ہے۔

محدود تصورِ عبادت کا افسوس ناک نتیجہ :

عبادت کے محدود تصور کا نقصان یہ ہوا کہ صرف عبادات ہی کو عبادت سمجھ لیا گیا اور عبادات

میں ذرا ذرا سے فرق سے مستقل گروہ بندیاں ہو گئیں، مختلف مسلک بن گئے اور مستقل طور پر طے ہو گیا کہ یہ مسجد فلاں مسلک والوں کی ہے اور وہ فلاں مسلک والوں کی۔ عبادات میں فرق بھی ثانوی نوعیت کا ہے مثلاً کسی نے ہاتھ سینے پر باندھ لئے اور کسی نے ذرا نیچے، کسی نے آمین زور سے کہی اور کسی نے آہستہ، کسی نے رفع یدین کیا اور کسی نے نہیں کیا، حالانکہ دین میں ان سب کی اجازت موجود ہے۔ دین میں جن چیزوں کی حیثیت فروعی اور ثانوی تھی اُن کو مقدم ترین سمجھ لیا گیا۔ وجہ کیا ہے؟ یہی کہ عبادت کا صحیح تصور اور اس کی روح سامنے نہیں ہے۔ یہ تو یاد ہی نہیں کہ نماز کی اصل روح "اِسْتِحْضَارُ اللّٰہِ فِی الْقَلْبِ" یعنی دل میں اللہ کی یاد ہے، اس کی اصل جان، خشوع اور خضوع یعنی عاجزی کے ساتھ اللہ کے سامنے جھک جانا ہے۔ جیسا کہ سورۂ مؤمنون کے آغاز میں فرمایا گیا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ﴿۲﴾

"بلاشبہ فلاح پا گئے وہ ایمان والے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں۔"

جب تک یہ خشوع موجود نہ ہو اس وقت تک نماز کا حق ادا نہیں ہوتا اور "عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات" کے مصداق اگر اللہ کی ذاتی محبت قلب میں موجود نہ ہو تو سارے قوانین اور ضابطے محض ایک رسم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

عبادت کی ضد: استکبار:

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ عبادت اصل میں اللہ کے احکامات کے سامنے دلی آمادگی کے ساتھ جھک جانے اور بچھ جانے کا نام ہے۔ اس کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ یہ زندگی کے کسی ایک گوشے میں محدود نہ ہو، بلکہ پوری زندگی پر محیط ہو۔ اس بات کو مزید اچھی طرح سمجھنے کے لئے سورۂ مومن آیت **60** پر توجہ فرمایئے، جس میں "عبادت" کی ضد کے طور پر لفظ "استکبار" آیا ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ

سَيَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيۡنَ ﴿۶۰﴾

''اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ کو پکارو، میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ اور جو لوگ میری عبادت سے استکبار (سرتابی اور سرکشی) کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔''

معلوم ہوا کہ عبادت کی ضد استکبار، سرتابی، سرکشی اور اپنی مرضی پر چلنا ہے۔ عربی مقولہ ''تُعۡرَفُ الۡاَشۡيَاءُ بِاَضۡدَادِهَا '' (اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) کے مصداق عبادت کی حقیقت ان الفاظ کے ذریعہ سمجھی جا سکتی ہے جو اس کی ضد کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی عبادت کی ضد یہ طرزِ عمل ہے کہ اللہ کی مرضی کے مقابلہ میں اپنی انا اور اللہ کے حکم کے مقابلہ میں اپنے نفس کے حکم کو ترجیح دی جائے۔ اس طرزِ عمل کو قرآن حکیم میں اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا معبود بنا لینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ فرقان آیت **43** میں فرمایا گیا:

اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ

''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے؟''

ایسا شخص گویا اللہ کے بجائے اپنے نفس کی عبادت کر رہا ہے۔ اللہ کے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی یا زمانے کے چلن اور معاشرے کے رسم و رواج کی تقلید کرنا درحقیقت عبادت کی ضد ہے۔

عبادت کی شرطِ لازم : اخلاص:

عبادت کے ضمن میں قرآن حکیم میں یہ مضمون بھی صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ عبادت خالصۃً اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ چنانچہ سورۂ زمر آیات **2 - 3** میں فرمایا گیا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ﴿۲﴾ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ

''(اے نبیؐ) ہم نے حق کے ساتھ اس کتاب کو آپ کی طرف نازل کیا ہے، پس آپ اللہ

کی بندگی کیجئے، پوری اطاعت اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے! یاد رکھیے کہ خالص اطاعت بس اللہ ہی کے لئے ہے۔“

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر آیت 11 میں فرمایا:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿﴾

”(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ ساری اطاعت صرف اسی کے لئے خالص ہو جائے“۔

اللہ غیور ہے اور وہ خالص اطاعت چاہتا ہے۔ اگر کوئی شخص کچھ معاملات میں اللہ، کچھ میں رسم و رواج، کچھ میں بے سند روایات اور کچھ میں خواہشاتِ نفس کی اطاعت کر رہا ہے تو یہ کئی رنگ کی اطاعت اللہ کو قبول نہیں اور ایسے شخص کے لئے سورہ بقرہ آیت 85 میں وعید ہے کہ:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿﴾

”کیا تم کتاب (الٰہی) کے بعض احکامات کو تو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے ہو تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں، اُن کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رُسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں ڈال دیئے جائیں اور جو تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق و ربوبیت:

آیہ مبارکہ یٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ...... میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں...... ایک اُس کا رب ہونا اور دوسرے اُس کا خالق ہونا۔ درحقیقت یہ دو صفات ہی دعوتِ عبادتِ رب کی دلیلیں ہیں۔ یعنی وہی تمہارا خالق، تمہیں وجود بخشنے والا ہے اور وہی تمہارا پروردگار اور پالنہار بھی ہے، لہٰذا صرف اُسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔

انسان نہ تو خود بخود پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی وہ خود اپنا خالق ہے۔ سورۂ طور آیت 35 میں فرمایا:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

''کیا وہ خود سے پیدا ہو گئے یا انہوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا ہے؟''

معلوم ہوا کہ ہم مخلوق ہیں اور کوئی ہمارا خالق ہے۔ پس جو خالق ہے اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ مخلوق پر اُس کی مرضی چلے۔ یہی بات سورۂ اعراف آیت 54 میں فرمائی گئی کہ: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (''خبردار ہو جاؤ، وہی خالق ہے اور اسی کی حکومت و فرماں روائی ہے'')۔ عقلِ سلیم اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ اُس کی بات مانی جائے۔ آدمی نہ صرف خود اپنا خالق نہیں بلکہ اُس کے آباء و اجداد بھی اس کے خالق نہیں اور وہ بھی مخلوق تھے۔ لہٰذا یہ جائز نہیں کہ بلا سوچے سمجھے آباء و اجداد کے طریقہ کی پیروی کی جائے اور کسی عمل کے بارے میں وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (''ہم نے اسی طریقہ پر اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے'') کو دلیل بنا کر آباء پرستی شروع کر دی جائے۔ اس لئے آیتِ مبارکہ میں آگے اضافہ فرما دیا کہ: وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی جو تم سے پہلے تھے اُن سب کا خالق بھی وہی اللہ ہے جو تمہارا خالق ہے۔ اُن کے طور طریقے اگر اللہ کے حکم کے مطابق ہوں تب تو اُن کی پیروی کی جائے گی، لیکن اگر اُن کی روش اس کے برعکس ہو تو اُن کا یہ حق ہرگز نہیں کہ ان کی پیروی کی جائے۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ اللہ صرف تمہارا خالق ہی نہیں، بلکہ وہ تمہارا ''رب'' بھی ہے۔ وہ تمہاری تمام ضروریات پوری کر رہا ہے۔ تمہیں درجہ بدرجہ ترقی دیتے ہوئے اور ہر درجہ کی تمام ضروریات کا اہتمام کرتے ہوئے تمہیں تمہارے مقامِ کمال کی طرف لے جا رہا ہے۔ ماں کے دل میں مامتا، باپ کے دل میں شفقت اور عزیزوں کے دل میں محبت اُسی کی پیدا کردہ ہے۔ موسموں کی تبدیلی، بارش کا نظام، زمین میں غذا پیدا کرنے کی قوت اور اُس پر تمہارے فائدہ کے لئے چوپایوں کا وجود، نظامِ شمسی اور اس میں موجود کشش، غرض یہ کہ یہ پورا نظام اسی کی شانِ ربوبیت کا مظہر ہے۔ پس وہی تمہارا خالق ہے اور وہی تمہارا رب ہے۔

عام طور پر جب ہم رب کی شرح کرتے ہیں تو بس ربوبیتِ جسمانی پر آ کر ٹھہر جاتے ہیں، حالانکہ ربوبیت صرف جسم و جان کی ضروریات کی فراہمی تک محدود نہیں بلکہ اس میں روح کی تسکین اور عقل کی رہنمائی کا معاملہ بھی شامل ہے۔ اسی لئے اللہ نے ہماری روح کی تسکین اور عقل کی رہنمائی کے لئے انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں۔

ربوبیت و تخلیق کی معرفت کا لازمی تقاضا:

پس یَـٰٓأَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ کے الفاظ میں دعوتِ عبادتِ رب کے لئے دلیل دی گئی کہ بندگی اور پرستش کرو اُس ہستی کی جو:

i- تمہارا رب ہے یعنی جس نے تمہاری جسمانی ربوبیت کے لئے کائنات کا نظام بنایا اور تمہاری روح کی تسکین اور عقل کی رہنمائی کے لئے انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں۔

ii- تمہارا اور تمہارے آباء و اجداد کا بھی خالق ہے۔

جب اپنے رب اور خالق کی معرفت حاصل ہوگئی اور یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ نظامِ کائنات از خود چند لگے بندھے قوانین کے تحت نہیں چل رہا، بلکہ اس میں ہر آن اور ہر لحظہ اللہ کا حکم جاری و ساری ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ خود کو اپنے رب کے سامنے بچھا دیا جائے اور بکمالِ محبت و رغبت کے ساتھ اس کے تمام احکامات کی اطاعت کی جائے۔

"لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" کی شرح:

آیت کا آخری ٹکڑا "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" عبادتِ رب کے ثمرہ و نتیجہ کو بیان کر رہا ہے کہ اے لوگو! تمہیں عبادتِ رب کی دعوت اس لئے دی جا رہی ہے "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" تاکہ تم بچ جاؤ۔ تقویٰ کا اصل مفہوم ہے "بچنا" یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنا اور نتیجۃً اس کی ناراضگی اور سزا سے بچنا۔ عربی لغت میں تقویٰ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ جب انسان کسی خاردار جنگل میں سے گزرتے ہوئے جھاڑیوں اور کانٹوں سے اپنے کپڑوں کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں رہتے ہوئے خود کو اللہ کی نافرمانیوں سے بچا کر لے جانا تقویٰ ہے۔ گویا "لَعَلَّكُمْ

تَتَّقُوْنَ" سے مراد ہے کہ اگر عبادت رب کی دعوت قبول کرو گے تو دنیا کی عارضی لذتوں کے حصول کی خاطر دھکے کھانے سے بچو گے اور آخرت کی ہلاکت خیزی سے محفوظ رہو گے۔ اگر عبادت رب کو اپنی زندگی میں اختیار نہ کیا اور اپنی باگ ڈور اپنے نفس کے ہاتھ میں دے دی تو دنیا میں بھی دردر کی ٹھوکریں کھاؤ گے اور آخرت میں بھی ابدی خسارے سے دوچار ہو گے۔

نوع انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ انسان اصل میں افراط وتفریط کے مابین دھکے کھا رہا ہے۔ انسان نے جاگیردارانہ نظام سے نکلنے کی کوشش میں اپنے لئے جمہوریت کا نظام اختیار کیا، لیکن جمہوریت کا دور شروع ہوا تو اس میں وہ خباثتیں موجود تھیں جنہوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی مکروہ صورت اختیار کرلی۔ اس انتہا تک پہنچ کر انسان نے سوچا کہ وہ ایک تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہو گیا ہے تو پھر واپس لوٹا، لیکن اب دوسری انتہا تک جا پہنچا۔ اس نے اپنی عقل سے یہ نظام تجویز کیا کہ انفرادی ملکیت کو ختم کر کے تمام ذرائع و وسائل کو ایک مرکزی نظام کے تحت لے آنا چاہیے۔ اس طرح انسان کی انفرادیت اور اس کی آزادی سلب ہو گئی۔ انسانیت ختم ہو کر رہ گئی اور اب سب کے سب انسان حیوانی سطح پر آ گئے اور پورا ملک جانوروں کے پنجرہ کی طرح ایک جیل خانہ بن گیا۔ پس اگر انسان عبادت رب کی روش اختیار نہیں کرے گا یعنی اللہ کی اطاعت اختیار کر کے اس کی مرضی کے مطابق نظام قائم نہیں کرے گا تو اسی طرح دھکے کھاتا رہے گا۔ ایک طرف جانے کے بعد پھر وہاں سے گھبرا کر واپس لوٹے گا لیکن پھر بھی اس کا قدم صراطِ مستقیم پر نہیں ٹکے گا اور وہ ایک دوسری انتہا تک جا پہنچے گا۔ وہاں پہنچ کر کوئی ردعمل پیدا ہو گا تو کہیں تیسری طرف جا نکلے گا۔ افراط وتفریط کے ان دھکوں سے بچ نکلنے کی واحد صورت یہی ہے کہ عبادت رب کی اس دعوت پر لبیک کہا جائے اور اللہ کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لیا جائے۔ یہ وہ صراطِ مستقیم ہے جو ایک متوسط شاہراہ ہے اور ایک ایسے عادلانہ نظام تک لے جاتی ہے جو ہر اعتبار سے متوازن ہے۔ جس میں زندگی کے تمام تقاضوں کو اعتدال کے ساتھ سمو دیا گیا ہے۔ یہ اللہ کی بندگی کا راستہ

ہے جسے اختیار کر کے نوعِ انسانی دنیا میں افراط وتفریط کے دھکوں سے اور آخرت میں اللہ کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے بچ سکتی ہے۔

غور کا مقام:

اب تک ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ قرآن کی اصل دعوت عبادتِ رب ہے اور اس کی مخاطب کوئی ایک قوم یا گروہ نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی ہے۔اس وقت اس دعوت کی امین اُمتِ مسلمہ ہے اور نوعِ انسانی تک اِس دعوت کو پہنچانا اس کی ذمہ داری ہے۔ہمارے لئے غور کا مقام یہ ہے کہ بدقسمتی سے یہ امت آج خود اس بات کی محتاج ہے کہ اس تک یہ دعوت پہنچائی جائے۔چنانچہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے ہم خود اس دعوت پر لبیک کہیں، اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو اُستوار کریں اور پھر دنیا کے سامنے اس دعوت کے داعی بن کر قول وعمل سے اس کی تبلیغ کریں۔

فرض عبادات کا بندگیٔ رب سے تعلق:

عبادت کے اس وسیع اور جامع مفہوم کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب یہ جان لیجئے کہ فرض عبادات یعنی ارکانِ اسلام کا اس سے کیا تعلق ہے۔یہ عبادات اس عظیم عبادت یعنی اللہ کے سامنے بچھ جانے کے لئے انسان کو تیار کرتی ہیں اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اِن سے انسان میں وہ قوت وصلاحیت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ عبادتِ رب کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

نماز کا اصل مقصد: عبادتِ رب اور اطاعتِ خالق میں سب سے بڑی رکاوٹ جو انسان کو درپیش ہوتی ہے وہ غفلت ،نسیان اور بھول ہے۔انسان کا اپنے معمولات میں حد درجہ اُلجھ جانا اور ان میں کولہو کے بیل کی طرح مصروف رہنا، دراصل ایک ایسا چکر ہے جو انسان کو اپنے اندر گم کر لیتا ہے۔اس لفظ ''گم'' سے میرا ذہن علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف منتقل ہوا ہے کہ:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق!

انسان کی کیفیت عام طور پر یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماحول، اپنی ضروریات کی فراہمی اور اپنی پریشانیوں میں گم ہوکر رہ جاتا ہے۔ کاروبار کی فکر، ملازمت کی فکر، اہل وعیال کی فکر، بچوں کے دکھ اور بیماری کی فکر، بچوں کی تعلیم وتربیت اور ان کی شادی بیاہ کی فکر اور نہ جانے کتنے مسائل کے روگ ہیں جو انسان کو لاحق رہتے ہیں اور ان میں کھو جاتا ہے۔ اس گمشدگی کی حالت سے انسان کو نکالنے کے لئے نماز پنجگانہ کا نظام ہے۔ نماز انسان کو دن میں پانچ مرتبہ تمام مصروفیات سے کھینچ کر باہر نکالتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ("نماز قائم کرو میری یاد کے لئے"، طٰہٰ: 14)۔ دن میں پانچ وقت اللہ کے حضور کھڑے ہو اور ہر رکعت میں اپنے اس عہد و میثاق کو تازہ کرو کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ("پروردگار! ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے")۔ ہر رکعت میں اپنے اس قول و قرار کی تجدید کرکے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرو، اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کو اپنے شعور میں اُجاگر کرو اور اُس ہستی کو یاد رکھو جس سے تم نے یہ عہدِ وفاداری اُستوار کیا ہے۔ نماز کا اصل مقصد ہی یادِ الٰہی ہے اور اسی یادِ الٰہی سے ان حقائق کی یاد دہانی ہوتی ہے جن کا نام ایمان ہے۔ پس نماز وہ فریضہ ہے جو انسان کو اس گمشدگی کی حالت سے دن میں پانچ بار نکالتی ہے اور اُسے یاد دلاتی ہے کہ وہ کسی کا غلام و بندہ ہے اور اُس نے کسی سے عہدِ اطاعت اور عہدِ وفا اُستوار کر رکھا ہے اور اُسے اپنے تمام معمولات میں اس عہد کی پابندی کرنی ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت: عبادتِ رب کے راستہ کی دوسری بڑی رکاوٹ دنیا کی محبت ہے جس کا سب سے بڑا مظہر مال کی محبت ہے۔ مال ہی وہ ذریعہ ہے جس سے دنیا کی ہر چیز حاصل کی جاسکتی ہے۔ شہرت، حشمت، وجاہت، عزت، منصب، اقتدار، غرض یہ کہ نفس کی ہر مطلوب شے مال

کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ گویا کہ دنیا اور مال لازم وملزوم ہیں۔ یہ مال کی محبت ہی ہے جو حق کے راستے میں انسان کے پیر کی بیڑی بن جاتی ہے۔ یہ مال ہی وہ چیز ہے جس کے لئے انسان حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہر الیتا ہے اور اللہ کے احکامات سے رُوگردانی کرتا ہے۔ چنانچہ مال کی محبت کو کم کرنے اور اس کو دل سے کھرچنے کے لئے زکوٰۃ کی عبادت دی گئی۔ اپنے مالوں میں سے زکوٰۃ، صدقات اور خیرات نکالو اور انہیں اللہ کی خوشنودی کے لئے صرف کرو۔ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (ان کے اموال میں سے صدقات وصول کیجئے کہ آپ ﷺ اس کے ذریعہ سے انہیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں، التوبہ: 103)۔ مال کی محبت کو دل سے نکالنے کے لئے علاج تجویز کیا گیا کہ خرچ کرو اللہ کی راہ میں! اس طرح یہ نجاست دل سے دُھلے گی اور تمہارا تزکیہ ہو جائے گا۔

روزہ کی حکمت: عبادتِ رب کی تیسری رکاوٹ ہمارے نفس کی حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی خواہشات ہیں۔ ہمیں زندگی برقرار رکھنے کے لئے کھانے اور پانی کی ضرورت ہے اور بقاءِ نسل کے لئے ہمارے اندر جنسی خواہشات پیدا کی گئی ہیں۔ یہ تمام ضروریات اپنی جگہ پر درست ہیں۔ لیکن ان خواہشات میں حدِ اعتدل سے بڑھ جانے کا میلان موجود ہے۔ جب یہ حدِ اعتدال سے تجاوز کرتی ہیں تو تقاضا کرتی ہیں کہ حکم اللہ کا نہیں ہمارا چلے گا۔ مثلاً جب جنسی جذبہ اشتعال میں آتا ہے تو نفس یہ مطالبہ کرتا ہے کہ میرا یہ تقاضا لازماً پورا ہونا چاہئے، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اللہ کیا کہتا ہے، رسول کا کیا حکم ہے، حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے! نفس کے اس منہ زور گھوڑے کو قابو میں کرنے اور اس کے تقاضوں کو ایک فطری حد تک محدود رکھنے کے لئے روزہ فرض کیا گیا۔ سورۃ بقرہ آیت 183 میں ارشاد فرمایا گیا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿﴾ ("اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ

تم بچ سکو!'')۔تمہارے نفس کے تقاضوں کو قابو میں کرنے کی صلاحیت اور قوت روزہ کی عبادت سے پیدا ہوگی۔روزہ کی بدولت اِن میں سے کوئی تقاضا بھی اتنا زورآور نہیں رہے گا کہ تم سے اپنی من مانی کرا سکے اور تم کو یہ بات بھلا دے کہ تم اللہ کے بندے ہو اور اللہ کے قانونِ حلال وحرام کے پابند ہو۔اس طرح تم اللہ کے احکامات کو توڑنے کی جسارت سے بچ سکو گے۔

حج کی جامعیت: حج کی عبادت میں وہ تمام چیزیں جمع کر دی گئی ہیں جو ہمیں نماز، زکوٰۃ اور روزہ سے حاصل ہوتی ہیں۔اس میں یادِ الٰہی بھی ہے، وقتی طور پر دنیوی اسباب سے کٹ جانا بھی ہے، انفاقِ مال بھی ہے، جسمانی مشقت بھی ہے اور نفس کے تقاضوں کو ضبط میں رکھنے کے لئے کچھ پابندیاں بھی ہیں۔چنانچہ حج ایک انتہائی جامع عبادت ہے۔

تو یہ چاروں عبادات انسان کو تیار کرتی ہیں کہ وہ عبادتِ رب کے راستہ پر گامزن ہو سکے جو اس کی تخلیق کا مقصد ہے اور وہ اپنے اُس عہد پر قائم رہ سکے جو اُس نے دنیا میں آنے سے قبل عالمِ ارواح میں کیا تھا۔اس عہد کا ذکر سورۂ اعراف آیت 172 میں اس طرح ہے کہ اللہ نے پوچھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى یعنی کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، تو سب پکار اٹھے کہ کیوں نہیں، ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے! اس عہد کی تجدید ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں کرتے ہیں۔اسی بندگیٔ رب کی دعوت آیت زیرِ مطالعہ میں دی جارہی ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اے لوگو! عبادت کرو اُس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا اور اُن کو بھی جو تم سے پہلے گزرے تا کہ تم بچ سکو۔'' (البقرہ: 21)

خلاصہ کلام:

آخر میں اس ساری بحث کا لبِ لباب اور خلاصہ ذہن نشین کر لیجئے کہ بنی نوع انسان کے نام قرآن کا اصل پیغام اور اس کی اصل دعوت ''عبادتِ رب'' کی دعوت ہے۔یعنی انسان سے اس

کی پوری زندگی میں کمال محبت وشوق کے ساتھ اللہ کی کامل اطاعت مطلوب ہے۔عبادت محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ فرض عبادات پوری زندگی کو اللہ کی غلامی اور بندگی میں دینے کے لئے انسان کو تیار کرتی ہیں۔''عبادتِ رب'' کا راستہ کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔اس راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں موجود ہیں۔بڑے بڑے لالچ، ترغیبات اور بڑی خوش نما لذتیں انسان کو اس راہ سے روکتی اور اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ان تمام رکاوٹوں کو دور کرنے اور ان تمام ترغیبات سے بچنے کے لئے دین کے نظام میں یہ عبادات تجویز کی گئی ہیں۔نماز اللہ کے ذکر اور اپنے مقصدِ تخلیق سے غفلت کا علاج ہے۔زکوٰۃ دل سے مال کی محبت کھرچنے کا ذریعہ ہے۔روزہ نفس کے منہ زور گھوڑے کو لگام دینے اور اس کے تقاضوں کو حدِ اعتدال پر رکھنے کی مشق ہے۔حج ان تینوں عبادات کی جامع عبادت ہے، جس میں ان کے تمام فائدے جمع کر دیے گئے ہیں۔اگر یہ حقائق سمجھ میں آجائیں تو پھر ان شاءاللہ دین کا پورا نقشہ اور اس کے تقاضے واضح ہو جائیں گے اور اس آیت کریمہ کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے گا کہ:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿﴾

''اے لوگو! عبادت کرو اُس رب کی جس نے تمھیں پیدا کیا اور اُن کو بھی جو تم سے پہلے گزرے تا کہ تم بچ سکو۔'' (البقرہ: 21)

اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ

اے اللہ میری مدد فرما اپنے ذکر، شکر اور اچھی عبادت کے لئے

(نسائی، ابوداؤد)

قرآنِ حکیم کا دوسرا تقاضا -- شہادت علی النّاس

''عبادتِ رب'' کے بعد قرآنِ حکیم کا دوسرا تقاضا ہے ''شہادت علی النّاس''۔ یہ تقاضہ سورۂ بقرۃ آیت **143** میں اس طرح بیان ہوا :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴿﴾

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امّت بنایا کہ تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر
اور رسول گواہ بن جائیں تم پر۔''

آیتِ مبارکہ کا محل و مقام :

قرآنِ حکیم ایک مربوط کلام ہے اور اس کی ہر آیت سلسلۂ کلام سے ربط و تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم کے فہم کے لئے نظمِ آیات اور سیاق و سباق کا علم انتہائی ضروری ہے۔ لہٰذا اوّلاً ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ کیا بحث اور گفتگو چل رہی ہے جس کے ضمن میں یہ آیتِ مبارکہ ایک اہم کڑی کی حیثیت سے نازل ہوئی ہے۔

سورۃ البقرہ کے ابتدائی دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانی کرداروں کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ اس کتابِ ہدایت سے استفادہ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کفر میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں اور ان پر تعصب اور ضد کا اتنا شدید غلبہ ہوگیا ہے کہ اب کوئی دعوت اُن پر اثر نہیں ڈال سکتی۔ تیسرے وہ کہ جو بین بین ہیں۔ جو اگرچہ اپنے آپ کو اہلِ ایمان ہی میں شمار کرتے ہیں لیکن درحقیقت ان کو نفاق کا مرض لاحق ہے اور وہ مومن نہیں ہیں۔ تیسرے رکوع میں قرآنِ حکیم کی مرکزی اور آفاقی دعوت ''دعوتِ عبادتِ رب'' بیان کی گئی ہے جس کی تفصیل سامنے آچکی ہے۔ چوتھے رکوع میں حضرت آدمؑ کی تخلیق اور اُن کو خلافتِ ارضی عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔ اسی رکوع میں ابلیس کی انسان سے دشمنی اور پھر

حضرت آدمؑ ، اماں حوا سلام علیہا اور ابلیس لعین کے زمین پر آنے کا ذکر ہے ۔ اس کے بعد پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل دس رکوع بنی اسرائیل سے طویل خطاب پر مشتمل ہیں ۔ بنی اسرائیل کی حیثیت درحقیقت سابقہ امتِ مسلمہ کی ہے ۔ مسلمانوں سے قبل انہیں حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ کتاب اور شریعت عطا کی گئی ۔ بنی اسرائیل سے طویل خطاب میں اُن کی شریعت سے پہلو تہی اور بد اعمالیاں بیان کی گئیں ۔ گویا دس رکوعوں میں بنی اسرائیل کے تمام جرائم کا خلاصہ اُن کے سامنے رکھ دیا گیا ۔ اس کے بعد چار رکوعوں میں اعلان کیا گیا کہ بنی اسرائیل اپنے جرائم کی پاداش میں ''امتِ مسلمہ'' کے مقام ومرتبہ سے معزول کئے جا رہے ہیں اور اب اس مقام پر نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے والوں کو فائز کیا جا رہا ہے ۔ اس نئی امت کے لئے مسجدِ حرام کو قبلہ مقرر کیا گیا ۔

چودھویں رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب کے بعد پہلے مسجدِ حرام کی تاریخ بیان کی گئی ۔ اس گھر کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اللہ کے حضور جو دعائیں کی تھیں اُن کا ذکر آیا ۔ پھر سترہویں رکوع میں تحویلِ قبلہ کا حکم آیا اور اس کے ساتھ ہی آیت زیرِ درس میں مسلمانوں کے لئے منصبِ امامت کے مقام پر فائز کئے جانے کا اعلان ہوا ۔ گویا تحویلِ قبلہ دراصل تحویلِ امت کی ایک علامت تھا ۔ یہ ہے وہ سلسلۂ کلام جس کے ذیل میں یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی ۔

امتِ مسلمہ کا مقصد :

اس آیت میں درحقیقت امتِ مسلمہ کو امامت کے مقام پر فائز کیے جانے کا مقصد بیان کیا جا رہا ہے ۔ آیت کے الفاظ پر پھر غور کیجئے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴿﴾

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت بنایا کہ تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر

اور رسول گواہ بن جائیں تم پر۔"

اس آیتِ مبارکہ میں سب سے پہلا لفظ "کَذٰلِکَ" ہے جس کا ترجمہ ہوگا: "ایسے ہی" یا "اسی طرح"۔ لفظ "کَذٰلِکَ" نے امت کے بارے میں اس اعلان کو تحویلِ قبلہ کی بحث کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ یعنی جو تحویلِ قبلہ کا حکم دیا جا رہا ہے اسے کوئی معمولی سا واقعہ نہ سمجھو۔ یہ تو درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اب بنو اسرائیل کو امت کے منصب سے معزول کر دیا گیا، اُن کا قبلہ منسوخ کر دیا گیا۔ اب اس قبلۂ ابراہیمی کے گرد ایک نئی امت کی تشکیل ہو رہی ہے جسے "شہادت علی الناس" کی ذمہ داری کے مقصد کے تحت کھڑا کیا جا رہا ہے۔

"امت" کا مفہوم :

"کَذٰلِکَ" کے بعد الفاظ ہیں: "جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا" (ہم نے تم کو بنایا درمیانی امت!) اس ٹکڑے میں لفظ "امت" پر غور کیجئے۔ مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے قرآنِ حکیم کی اصل اصطلاح "امت" ہے۔ قرآنِ حکیم مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے لفظ "قوم" استعمال نہیں کرتا۔ احادیثِ نبوی ﷺ میں بھی مسلمان امت کے لئے "قوم" کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ قومیت کی بنیاد نسل، وطن یا زبان ہوتی ہے۔ اسلام کی دعوت کسی خاص نسل، وطن یا زبان سے تعلق رکھنے والوں کے لئے نہیں ہے۔ "دعوتِ عبادتِ رب" کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ تمام سابق انبیاءؑ کی دعوت اپنی اپنی قوم کے لئے تھی۔ ان کا کلمۂ خطاب "یٰقَوْمِ" ہوتا تھا۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی دعوت کے مخاطبین کے لئے قرآنِ حکیم میں "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ" (اے بنی نوعِ انسان!) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ گویا اسلام کی یہ دعوت قومیت سے ایک بلند تر منزل اور سطح کے لئے ہے۔

جو لوگ اسلام کی دعوتِ عبادتِ رب کو قبول کر لیتے ہیں اور اللہ کے ساتھ اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لیتے ہیں وہ اب مل جل کر ایک جمعیت بنیں گے خواہ وہ مغرب سے ہوں یا مشرق سے، شمال کے ہوں یا جنوب کے، کوئی زبان بولتے ہوں، کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی

شکل وصورت یا رنگ کے حامل ہوں ۔ اس اجتماعیت کو قرآن حکیم ''امت'' قرار دیتا ہے ۔ لغوی اعتبار سے امت کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے افراد پر مشتمل ایک اجتماعیت جن کے درمیان قدرِ مشترک ،کوئی مقصد ہو جو انہیں جوڑے رکھے ۔

دوسرا لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے قرآنِ حکیم میں آیا ہے وہ ''حزب'' ہے جس کے معنی ہیں جماعت ۔قرآنِ حکیم اللہ کے ساتھ عہدِ اطاعت قائم کرنے والوں کو سورہ مجادلہ آیت 22 میں'' حِــزْبُ اللہِ'' یعنی اللہ کی جماعت قرار دیتا ہے ۔ جو لوگ اللہ کے ساتھ عہدِ اطاعت پر قائم نہیں ہوتے قرآنِ حکیم انہیں سورہ مجادلہ ہی کی آیت 19 میں ''حزبُ الشیــطــان ''یعنی شیطان کی جماعت کہتا ہے ۔اس طرح قرآن حکیم پوری نوعِ انسانی کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے یعنی حزبُ اللہ اور حزبُ الشیطان ۔سورہ مجادلہ آیت 22 میں فرمایا گیا اللہ کی جماعت کے لوگ ہی کامیاب ہونے والے ہیں ۔

''امتِ وسط'' کا مفہوم :

اس آیہ مبارکہ میں ''امت'' کی صفت کے طور پر لفظ ''وسط'' استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم ہے ''درمیانی'' ۔ چنانچہ ''اُمَّۃً وَّ سَــطـــاً'' کا لفظی ترجمہ ہوگا ''ایک درمیانی امت'' ۔گویا مسلمان اللہ کے رسول ﷺ اور عام انسانوں کے درمیان ایک واسطہ ہیں ۔اللہ کے رسول کی طرف سے دعوت مسلمانوں تک پہنچی اور اب اُن کا کام ہے کہ یہ دعوت نوعِ انسانی تک پہنچائیں ۔ اس بات کی تائید اسی آیہ مبارکہ کے اگلے ٹکڑے سے ہو رہی ہے جہاں فرمایا گیا لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ''تا کہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر'' ۔حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امت تک اللہ کی ہدایت کی تبلیغ و تعلیم کا حق ادا کر دیا ۔آپ ﷺ اپنے قول اور اپنے عمل سے حق کی شہادت دے چکے اور اللہ کی اطاعت پر مبنی نظامِ زندگی بالفعل قائم کر کے دکھا چکے ۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی گواہی ہو گئی امت پر ۔اب یہی گواہی بنی نوعِ انسان پر قائم کرنا امت کی ذمہ داری ہے ۔

امت پر لازم ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہدایت کو لوگوں تک پہنچائے اور اللہ کے دین کو عملاً نافذ کر کے دنیا کے سامنے حق کی شہادت دے۔

بعض مترجمین نے "اُمَّۃً وَّسَطًا" کا ترجمہ "بہترین امت" کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ آلِ عمران آیت **110** میں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" یعنی تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کی رہنمائی کے لئے اٹھایا گیا ہے۔ اللہ کی ہدایت کی امانت تمہارے پاس ہوگی اور نوعِ انسانی تک اسے پہنچانے کے ذمہ دار تم ہو گے۔ لہٰذا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اس آیت زیرِ بحث کا ترجمہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ "اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا........."۔

امتِ مسلمہ کا اجتماعی نصب العین :

آیت زیرِ بحث میں الفاظ "لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ" (تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر!)، امتِ مسلمہ کا ایک مقصد اور اجتماعی نصب العین معیّن کر رہے ہیں۔ دیگر اقوامِ عالم صرف اپنے لئے جیتی ہیں۔ اُن کا مقصد محض اپنی عزت، وقار، آزادی اور مفادات کا تحفظ، اپنے مسائل کا حل اور اپنی روایات اور مصلحتوں کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس امتِ مسلمہ پوری نوعِ انسانی کے لئے سرگرمِ عمل ہوتی ہے۔ اس ضمن میں سورۃ آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت **110** میں فرمایا گیا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

"تم وہ بہترین امت ہو، جسے لوگوں (کی بھلائی) کے لئے اٹھایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر (پختہ) ایمان رکھتے ہو۔"

یعنی لوگوں کو نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا امت کا اجتماعی نصب العین ہے۔

اجتماعی نصب العین کی اہمیت :

کسی بھی جمعیت کے لئے اجتماعی نصب العین بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر جمعیت کی حیثیت بے لنگر کے اُس جہاز کی سی ہوتی ہے جس کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی اور وہ لہروں کے تھپیڑوں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں قیام پاکستان سے لے کر اب تک حالات دن بدن ابتر ہوتے چلے گئے، تو اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہمارا کوئی اجتماعی نصب العین ہے ہی نہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے ذاتی معاملات ومسائل میں الجھا ہوا ہے، اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے فکرمند ہے اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند سے بلندتر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اُس کی سرگرمیوں کا مرکز ومحور یہی بن کر رہ گیا ہے کہ وہ اپنا گھر سجائے، اپنے کاروبار کو مزید ترقی دے، اپنے آرام وآسائش کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرے، اپنی کاروں کے ماڈل ہر سال بدلتا چلا جائے اور زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے عیاشی کی نت نئی راہیں تلاش کرے۔ اجتماعی نصب العین نہ ہونے کی وجہ سے ہماری قومی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا جس کے ہولناک نتائج ہم بھگت رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اجتماعی مقاصد کے لئے قربانی اور ایثار کا کوئی جذبہ محسوس ہی نہیں ہوتا۔

جہاں تک دنیا کی دوسری اقوام کا تعلق ہے تو اُن کی قومیت کی اساس اگرچہ غلط بنیادوں پر ہے لیکن وہ قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ چاہے نسل کی بنیاد پر قوم بنے ہوں، چاہے وطن اور علاقہ کی بنیاد پر، لیکن ان میں جب ایک "قوم" ہونے کا شعور پختہ ہو جاتا ہے تو اُن کے نزدیک اپنے ذاتی مفادات ثانوی درجہ کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اُن کی نگاہوں میں اصل اہمیت ایک قومی نصب العین کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اُن میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ اُن کو اپنی قومی عظمت کے لئے کام کرنا ہے اور اپنے وطن کا نام اونچا کرنا ہے۔

ہم وہ بدنصیب قوم ہیں جو اپنے نصب العین کو فراموش کر چکے ہیں۔ قومیت کا نعرہ ہم کو کبھی متاثر نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ تصور ہماری روایات اور تعلیمات کے منافی ہے۔ زبان ونسل،

رنگ وخون اور علاقہ ووطن کی بنیاد پر ہم کبھی بھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ہم خواہ کتنے ہی بگڑ جائیں اور کیسی ہی پستی میں گر جائیں، لیکن یہ چیزیں ہمیں کبھی بھی متاثر نہیں کرسکیں گی۔ ہماری ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخ ہے اور ہماری تاریخی روایات ہیں کہ ہم ایک عالمگیر برادری کا حصہ ہیں جس کی اساس رنگ، نسل اور علاقے کی بنیاد پر نہیں ہے۔ ایک طرف یہ خوبی ہے لیکن دوسری طرف یہ بدقسمتی ہے کہ ہمارا اصل نصب العین ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ہم ایک خلا میں زندگی بسر کرتے ہوئے ایک بے لنگر جہاز کی طرح موجوں کے رحم وکرم پر ہچکولے لے رہے ہیں۔

یہ بات تحریکِ پاکستان کے حوالہ سے اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ مسلم لیگ کی تحریک کو تقویت اُسی وقت حاصل ہوئی جب اس نے پاکستان کے مطالبہ کو ایک ''نصب العین'' کی حیثیت سے اختیار کیا۔لیکن پاکستان کے قیام کے بعد چونکہ قوم کو کوئی واضح نصب العین نہیں دیا گیا لہٰذا یہاں قومی سطح پر ایک خلا واقع ہوگیا۔ چنانچہ ہر فرد کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ومحور، اُس کی محنت اور کوشش کا ہدف اور اُس کی زندگی کا مقصد ذاتی سہولیات میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اجتماعی نصب العین اس نفسانفسی میں گم ہوکر رہ گیا۔

اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہمارے سامنے کوئی آفاقی اور اجتماعی نصب العین ہو۔ یہ ضرورت صرف دینی لحاظ سے اور آخرت کی جواب دہی کے اعتبار سے ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے ملی تشخص کے اعتبار سے بھی ضروری ہے تاکہ اس ملک میں بسنے والوں کو ایک بڑے مشن کے لئے متحد کیا جاسکے اور خاص طور پر نوجوان نسل کو بے یقینی کے اندھیروں سے نکال کر ایک واضح منزل کی صورت میں روشنی کا مینارہ دکھایا جاسکے۔ اس اعتبار سے زیرِ بحث آیت بڑی اہم ہے کہ یہ امتِ مسلمہ کا اجتماعی نصب العین بیان کر رہی ہے۔

''شہادت'' کا مفہوم اور دین میں اس کا مقام :

اس آیت میں '' شَہِیۡـد'' کی اصطلاح آئی ہے جس کا لفظی ترجمہ ''گواہ'' ہے۔ اللہ نے فرمایا:

”تا کہ تم ہو جاؤ گواہ نوعِ انسانی پر اور رسول ﷺ ہو جائیں گواہ تم پر“۔ گواہ بننے کی دو سطحیں ہیں، انفرادی اور اجتماعی۔

انفرادی سطح پر ہر مسلمان اپنی زبان سے گواہی دیتا ہے کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ...... ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں“۔ تو یہ قولی گواہی ہے جس سے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر عملی گواہی کا درجہ آتا ہے اور دنیا میں اصلاً وہی گواہی معتبر قرار پاتی ہے جس کی تائید انسان کے عمل سے ہو رہی ہو۔ اگر آپ قولاً ایک بات کا اعلان کریں مگر عملاً اُس کی تکذیب کر رہے ہوں تو دنیا اس بات کو معتبر نہیں مانے گی۔ لہٰذا قولی گواہی کے ساتھ عملی گواہی بھی زندگی کے پورے رویہ میں نظر آنی چاہیے۔ قولی گواہی کے ذریعہ ہم نے اللہ کے معبود ہونے، خالق و رب ہونے اور حاکم و مالک ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اسی طرح محمد ﷺ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانا ہے۔ اُس عہد کے بعد ہم پر لازم ہو گیا کہ ہم میں سے ہر فرد عملی طور پر اللہ کا فرمانبردار غلام بن جائے۔ اُس کی زندگی کا ہر عمل اور فعل اس بات کی گواہی دے کہ یہ شخص من مانی کرنے کے لئے آزاد نہیں ہے بلکہ ہر معاملہ میں اللہ کے احکامات کا پابند اور محمد ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہے۔ انسان کی عملی زندگی کی اس گواہی سے درحقیقت اس قولی گواہی ”اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ“ کا انفرادی سطح پر حق ادا ہو گا۔

اجتماعی اعتبار سے ہماری حیثیت ایک امت کی ہے، لہٰذا ہمیں یہ عملی گواہی صرف انفرادی سطح پر نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر بھی دینی ہو گی۔ اس اعتبار سے ضروری ہے ہماری پوری اجتماعی زندگی یعنی ہمارا ملکی نظام، ہمارے تمام قوانین، ہماری معیشت، معاشرت، تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت غرض یہ کہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ اللہ کے نازل کردہ دین و شریعت کے سانچے میں ڈھل جائے۔ اس سے عملی گواہی کی تکمیل ہو جائے گی۔ لہٰذا امت کے ہر فرد

پر لازم ہے کہ اجتماعی زندگی میں اللہ کے دین کے غلبہ کے لئے مال و جان سے بھرپور کوشش کرے۔ جو شخص یہ جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے اُسے اللہ کی بارگاہ سے ''شھید'' کا خطاب ملتا ہے۔ گویا یہ وہ سچا گواہ ہے جس نے جان کی بازی لگا کر اس بات کی گواہی دے دی کہ اس کائنات کا ایک ہی مالک اور ایک ہی حاکم ہے۔

لفظ ''شہادت'' کی مندرجہ بالا بحث سے ہمارے دین میں اِس کی اہمیت اور اس کا مقام واضح ہوتا ہے۔ شہادت ہی سے ہمارے اسلام کا آغاز ہوا۔ کلمہ شہادت پڑھ کر ہم امتِ مسلمہ میں شامل ہوئے اور اب ہمارے لئے بلندتر منزل ہے مقامِ شہادت یعنی اللہ کی حاکمیت تسلیم کرانے کے لئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا، بقول اقبال:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی!

فریضہ شہادت علی الناس کی اہمیت:

بحیثیت امتِ مسلمہ ہماری اجتماعی زندگی کا ہدف ہے ''شہادتِ حق''۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

''اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ عدل کے قائم کرنے والے بن کر گواہ ہوتے ہوئے اللہ کے لئے۔'' (النساء آیت 135)

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ

''اے ایمان والو! کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لئے، گواہ ہوتے ہوئے عدل کے۔''

(المائدہ آیت 8)

یہ گواہی صرف دنیا تک ہی محدود نہیں ہے۔ آخرت میں بھی امتِ مسلمہ کو پوری نوعِ انسانی پر اور نبی کریم ﷺ کو اپنی امت پر یہ گواہی دینا ہوگی۔ سورۃ النساء آیت 41 میں فرمایا گیا:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا

"پس اُس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور
اس امت پر (اے نبی ﷺ) ہم آپ ؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے۔"

روزِ قیامت اللہ کی عدالت میں ہر ہر قوم پر اُس کے نبی گواہی دیں گے کہ اے پروردگار تیری ہدایت ہم نے کسی کمی بیشی کے بغیر ان تک پہنچا دی تھی اور اپنے عمل سے ایک نمونہ پیش کر کے گواہی کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ یہی گواہی اپنی امت پر دیں گے۔ اس کے بعد پھر افراد کا عمومی محاسبہ ہوگا۔ لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ جو حق تم تک پہنچا دیا گیا تھا اُس کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ رہا؟

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں نبی اکرم ﷺ اور دیگر رسولوں کے لئے "شاہد" اور "شہید" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ سورۂ احزاب آیت 45 میں آپ ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿﴾

اے نبی ﷺ بے شک ہم نے آپ ﷺ کو بھیجا شاہد، مبشر اور نذیر (بنا کر)

سورۂ مزمل آیت 15 میں حضرت موسیٰؑ کے بارے میں الفاظ آئے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَى فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿﴾

"(اے لوگو!) بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیج دیا ہے، جیسے
کہ ہم نے فرعون کی طرف (حضرت موسیٰؑ کو) رسول (اور گواہ بنا کر) بھیجا تھا۔"

یہ ہے ہمارے دین میں شہادت کا تصور اور ہر نبی کو اسی شہادتِ حق کے لئے بھیجا جاتا تھا۔

شہادتِ حق کا ختمِ نبوت سے تعلق:

نبی اکرم ﷺ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب آپ ﷺ کی امت پوری نوعِ انسانی کے لئے گواہ بنا کر کھڑی کی گئی ہے۔ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ اللہ کے دین کی شہادت قول و عمل سے اور انفرادی و اجتماعی سطح پر پیش کرے۔ یہی درحقیقت اس امت کا مقصد ہے جس کے لئے اسے اللہ کی طرف سے چن لیا گیا ہے۔

امتِ مجتبیٰ :

سورۃ البقرہ کی آیت زیرِ درس کے علاوہ سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی امتِ مسلمہ کا مقصد شہادتِ حق کی ادائیگی قرار دیا گیا:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿﴾

''اور اللہ (کی راہ) میں جہاد کرو جیسا کہ اُس کے لئے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں چن لیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں رکھی۔ (یہ دین) راستہ ہے تمہارے والد ابراہیمؑ کا۔ اُنہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا، اس سے پہلے اور اب بھی۔ تا کہ (روزِ قیامت) رسول ﷺ گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر۔ پس قائم کرو نماز اور دو زکوٰۃ اور چمٹ جاؤ اللہ سے۔ وہ تمہارا دوست ہے۔ پس خوب دوست ہے اور خوب مددگار ہے۔''

سورۃ الحج کی اس آیۂ مبارکہ میں مسلمانوں کو اللہ کے دین کے لئے جہاد کرنے کی زوردار دعوت دی گئی۔ فرمایا گیا ھُوَ اجْتَبٰىكُمْ '' اس نے تمہیں (اس مقصد کے لئے) چن لیا ہے''۔ پھر ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ'' سے ''وَفِيْ هٰذَا'' تک کا کلام ترغیب وتشویق کے لئے ہے۔ ربطِ مضمون کے اعتبار سے ''هُوَ اجْتَبٰىكُمْ'' کا براہِ راست تعلق ''لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ'' سے جڑتا ہے۔ یعنی تمہیں اس نے چن لیا ہے، تا کہ رسول ﷺ تم پر گواہ بن جائیں اور تم بنی نوع انسان پر گواہ بن جاؤ۔

اس آیت میں امت کا فرضِ منصبی شہادت علی الناس بیان فرمانے کے فوراً بعد تین احکامات دیئے گئے، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اللہ سے چمٹ جاؤ! ۔ گویا ''شہادت علی الناس'' کے

ہدف تک پہنچنے کے لئے سفر کا آغاز اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ہوگا۔ وہ شخص بڑا ہی نادان ہے جو شہادتِ حق اور اس سے بھی بڑھ کر اقامتِ دین کے مراحل میں ایک زوردار چھلانگ لگا کر پہنچنا چاہے جب کہ اسے نہ اقامتِ صلوٰۃ کی کوئی فکر ہو اور نہ ادائے زکوٰۃ کی۔ ان عبادات کے بغیر نہ سیرت کی تعمیر ہوگی اور نہ دعوت وتبلیغ کا حق ادا ہوگا۔ نظامِ باطل کے خاتمہ اور اسلام کے نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لئے شاندار جلسے جلوس اور منظم مظاہرے صرف اُسی وقت مفید ثابت ہو سکتے ہیں جب کہ اِن میں حصہ لینے والے نماز اور زکوٰۃ کی عبادات خوبصورتی سے انجام دیتے ہوں۔ اِسی طرح جو لوگ بس نماز اور زکوٰۃ ہی کو پورا دین سمجھ بیٹھیں، اُن کی زندگی کے دوسرے معاملات اللہ کی اطاعت سے خالی ہوں، نہ دین کی مغلوبیت اُن میں کوئی غیرت وحمیت پیدا کرے اور نہ جہاد وقتال کی منازل اُن کے سامنے ہوں تو جان لیجئے کہ وہ بھی سخت مغالطے میں ہیں کیونکہ اُن کا تصورِ دین محدود ہی نہیں مسخ شدہ بھی ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے بعد تیسرا حکم ہے اللہ کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ سے چمٹ جانے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی وضاحت سورۂ آلِ عمران آیت **103** میں ملتی ہے جہاں فرمایا گیا: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی رسی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ " حَبْلُ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی رسی سے مراد ہے قرآنِ حکیم۔ جامع ترمذی کی ایک طویل حدیث کے مطابق جس کے راوی حضرت علیؓ ہیں، رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی عظمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ" کہ یہ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے۔ چنانچہ اللہ کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ چمٹ جاؤ کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآنِ حکیم کو مضبوطی سے تھامو اور اس کے مندرجہ ذیل حقوق ادا کرو:

۱- ایمان وتعظیم یعنی دل کی گہرائیوں سے ماننا کہ قرآنِ حکیم اللہ کا کلام ہے۔

۲- تلاوت یعنی آداب کے ساتھ روزانہ قرآنِ حکیم پڑھنا۔

۳- تفہیم یعنی قرآنِ حکیم کو سمجھنا اور اس پر غور و فکر کرنا ۔
۴- عمل یعنی قرآنِ حکیم کے احکامات پر انفرادی زندگی میں عمل کرنا اور اجتماعی زندگی میں ان کے نفاذ کے لئے کوشش کرنا۔
۵- تبلیغ یعنی قرآنِ حکیم کی تعلیمات دوسروں تک پہنچانا
خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے فرمایا:

وَ قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَالَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ ، اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ ، كِتَابُ اللهِ

''اور یقیناً میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے تو اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز ہے کتابُ اللہ!'' (مسلم)

سورۃ الحج کی اس آخری آیت کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ یہ شہادتِ حق ہی کی ذمہ داری ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی کو اپنا رسول منتخب فرماتا تھا۔ ختمِ نبوت کے بعد اب یہ ذمہ داری قیامت تک کے لئے امتِ مسلمہ کے سپرد کردی گئی ہے۔

امتِ محمدیؐ کی عظیم ذمہ داریاں :

یہ حقیقت ہے کہ جس کا مرتبہ بلند ہو اُس کی ذمہ داری بھی اُسی قدر عظیم ہوتی ہے۔ لہٰذا اللہ نے نبی اکرم ﷺ کی امت کو چن لیا اور اسے شہادتِ حق کی ادائیگی کی عظیم ذمہ داری کا حامل بنا دیا۔ نبی اکرمؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ''جو لوگ یہاں موجود ہیں اب اِن کا فرض ہے کہ اُن تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں'' کے الفاظ کے ساتھ یہ ذمہ داری امت کو منتقل فرما دی۔ اِس فرمانِ نبویؐ کے مطابق نوعِ انسانی کے سامنے شہادتِ حق اور تبلیغِ دینِ حق کی ذمہ داری کا بھاری بوجھ امت کے کاندھوں پر آگیا۔ اب امت کے ہر ہر فرد کو انفرادی طور پر اور امت کو بحیثیت مجموعی اجتماعی طور پر نوعِ انسانی کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق کی شہادت دینی ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو روزِ قیامت دوسروں کی گمراہی کا وبال ہمارے سر پر آئے گا۔

مقامِ افسوس ہے کہ آج امت کی اکثریت کو نہ اپنی ذمہ داری کا شعور ہے اور نہ ہی آخرت میں محاسبہ کا احساس۔ ہم اس بات سے تو بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہم سید المرسلین اور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی امت میں شامل ہیں لیکن ہمیں اس بات کا بالکل احساس نہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے کاندھوں پر کس قدر عظیم ذمہ داری کا بوجھ آپڑا ہے۔ شہادتِ حق کی ادائیگی کے بارے میں پہلے ہمارا احتساب ہوگا۔ بقیہ پوری نوعِ انسانی سے باز پرس بعد میں ہوگی، پہلے ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس ذمہ داری کو کس طرح ادا کیا؟ تم نبی ﷺ کے قائم مقام اور اللہ کی آخری کتابِ ہدایت کے حامل تھے۔ تم نے اپنے قول وعمل سے حق کی شہادت دینے کے لئے کیا محنت کی، کتنی توانائی لگائی اور کتنا مال کھپایا؟ کیا ان سوالات کا کوئی جواب ہمارے پاس ہے؟ کیا ہم بارگاہِ خداوندی میں اس کا کوئی عذر پیش کرسکیں گے؟ یہ ہے وہ نازک معاملہ جس کا شعور امت میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں شہادتِ حق کا مجاہدہ:

ظہورِ نبوت سے لے کر حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک آپ ﷺ کی ساری جدوجہد، کشمکش اور جہاد وقتال کا مرکز ومحور یہی فریضۂ شہادتِ حق رہا۔ آپؐ کی ساری محنت ومشقت میں یہ احساسِ ذمہ داری غالب رہا ہے کہ لوگوں پر حق کی گواہی دینے اور حق کے پہنچانے میں کوئی کمی نہ رہ جائے اور آخرت کی جواب دہی میں مشکل نہ پیش آئے۔ اسی احساس کی وجہ سے آپ ﷺ مکہ کے کوچہ وبازار میں پھرتے رہے۔ کبھی گالیوں کی بوچھاڑ کا سامنا ہوا تو کبھی پتھروں کی بارش کا، کہیں طنز واستہزاء کے تیر سہے تو کہیں گلے میں پھندا ڈال کر جان لینے کی کوشش کی گئی، کبھی حالتِ سجدہ میں پشت پر نجاست بھری اوجھڑی لا دی گئی تو کبھی راستہ میں کانٹے بچھائے جاتے رہے۔ آپ ﷺ کی آنکھوں کے سامنے جاں نثاروں کو تپتی دھوپ میں منہ کے بل گھسیٹا جاتا رہا، اُن کے سینوں پر آگ دہکائی جارہی ہے اور برچھیوں سے چھیدا جاتا رہا۔ پھر آپ ﷺ کو خاندان سمیت شعب ابی طالب میں محصور کر کے بھوک اور پیاس

سے تڑپا کر مار ڈالنے کے منصوبہ پر عمل کیا گیا۔ پھر طائف کا وہ سخت ترین دن بھی آیا جب بھرے بازار میں اوباش لڑکے آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیئے گئے، انہوں نے مذاق اڑایا اور پتھروں کی بارش سے آپ ﷺ کے مبارک جسم کو لہولہان کر دیا۔ پھر مکہ میں قتل کی تیاریاں ہیں، ہجرت ہے اور غارِ ثور میں پناہ ہے۔ مدینہ میں یہودیوں اور منافقوں کی سازشیں ہیں اور بدر و اُحد کے معرکے ہیں۔ میدانِ اُحد میں خود بھی مجروح ہیں اور سامنے محبوب ساتھیوں کے تڑپتے ہوئے لاشے ہیں۔ غزوۂ احزاب میں مہینہ بھر کا دلوں کو ہلا دینے والا کفار کا محاصرہ ہے اور تبوک میں وقت کی عظیم طاقت سے ٹکراؤ کے لئے اسباب کی قلت کے ساتھ طویل پُر مشقت سفر ہے۔

غور کیجئے! یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کس لئے ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ ایک طرف "شہادتِ حق" کی ذمہ داری کا احساس تھا جو نبی اکرم ﷺ کو تمام مراحل سے گزار رہا تھا اور دوسری طرف امت کے لئے آپ ﷺ کو اسوۂ حسنہ قائم فرمانا تھا تا کہ امت آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چل کر شہادتِ حق کی ادائیگی کی ذمہ داری ادا کر سکے اور آخرت کی جوابدہی کے لئے تیاری کر سکے۔

فریضۂ شہادتِ حق کی امت کی طرف منتقلی :

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اپنے تاریخی خطبہ میں شہادتِ حق کی ادائیگی کی ذمہ داری امت کی طرف منتقل فرما دی۔ خطبۂ حجۃ الوداع کو بجا طور پر حقوقِ انسانی کا ایک منشور اور ہدایتِ ربانی کا ایک خلاصہ کہا جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی 23 سال کی مسلسل کٹھن جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا کہ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک فریضۂ شہادت علی الناس کی تکمیل ہوگئی اور اللہ کا دین غالب ہوگیا۔ اب آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کرامؓ کے عظیم اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اس خطاب میں آپ ﷺ نے انتہائی اہم ہدایات ارشاد فرمانے کے بعد مجمع سے سوال کیا: اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ سنو! کیا میں نے اللہ کی ہدایت پہنچا دی؟ اس پر سوا لاکھ صحابہ کرامؓ کا مجمع پکار اٹھا: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَ

نَصِحْتَ --- ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا، حقِ امانت ادا کر دیا اور حقِ خیر خواہی ادا کر دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ کہ اے اللہ! تو بھی گواہ رہ کہ میری ذمہ داری پوری ہوگئی۔ اس سوال و جواب کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا" فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الغَائِبَ" جو لوگ یہاں موجود ہیں اب اِن کا فرض ہے کہ اُن تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس طرح فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی کی ذمہ داری امت کے کاندھوں پر منتقل ہوگئی۔ اب امت کے ہر فرد کو انفرادی طور پر اور امت کو اجتماعی طور پر یہ فریضہ سر انجام دینا ہے۔

فریضۂ شہادت علی الناس اور صحابۂ کرامؓ کا کردار :

اس فریضۂ شہادت علی الناس کی انجام دہی میں صحابہ کرامؓ نے جو مصائب جھیلے، ایثار و قربانی پیش کی اور جو محنتیں اور مشقتیں برداشت کیں، تاریخِ انسانی اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے خلافتِ راشدہ کی صورت میں نہ صرف مثالی عادلانہ نظام قائم کیا بلکہ اُس کی حدود مختصر عرصہ میں ایک وسیع علاقہ تک پھیلا دیں۔ یہ نظام بلاشبہ انسانیت کی معراج ہے۔ وہ نظامِ خیر اس وقت دنیا میں عملاً کہیں موجود نہیں لیکن آج بھی دنیا میں جو خیر، بھلائی اور خوبی کہیں نظر آتی ہے اور جو انسانی اقدار موجود ہیں وہ اسی صالح نظام کی برکات ہیں۔ اسی نظام نے انسان کو اُس کے حقوق و فرائض کا شعور بخشا اور رنگ و نسل اور زبان و وطن کے امتیازات ختم ہوئے۔ اسی نظام نے خواتین کو معاشرے میں ان کا جائز مقام دیا اور ان کے حقوق دلوائے۔ غیر مسلم بھی اس نظام کی برکات کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے **1937**ء میں وزارتوں کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ اپنی حکومت کے لئے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے دورِ حکومت کو بطور نمونہ سامنے رکھا جائے۔

صحابہ کرامؓ تو اپنی ذمہ داری بحسن و خوبی ادا فرما گئے۔ اب ہمیں قولی شہادت کے ساتھ ساتھ عادلانہ نظام قائم کر کے عملی شہادت دنیا کے سامنے پیش کرنی ہے۔ عملی شہادت قائم کئے بغیر

شہادت علی الناس کا فریضہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا پر اتمامِ حجت کے لئے عادلانہ نظام کا قیام امت پر لازم ہے۔ اگر امت ایسا نہیں کرتی تو روزِ قیامت حسابِ اُخروی کے وقت شرمندگی ورسوائی سے دوچار ہوگی۔ اللہ کا فیصلہ ہے :

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (الاعراف : 6)

''ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے اُن سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی!''

لمحہ فکریہ :

شہادت علی الناس کے اس فریضہ کی ادائیگی کے ضمن میں اب ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیئے۔ کیا ہم اس فرض کی انجام دہی کا کوئی احساس رکھتے ہیں؟ کیا ہمیں بحیثیت امت یہ شعور حاصل ہے کہ ہمارے کاندھوں پر کس قدر عظیم ذمہ داری کا بوجھ ہے؟ کیا ہمیں بنی نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت کے لئے قولی وعملی شہادت کی کوئی فکر ہے؟ اور اس سے بڑھ کر غور طلب بات یہ کہ دوسروں پر حق کی شہادت قائم کرنے سے پہلے کیا ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی ایک گوشہ سے بھی اس حق کی کوئی عملی شہادت دی جا رہی ہے؟

یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ ہماری موجودہ حیثیت خزانے کے سانپ کی سی ہے۔ ہم نہ تو خود اسلام کے عادلانہ نظام کی برکات سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کا موقع دے رہے ہیں۔ یہ بڑی ہی تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہم شہادتِ حق کا فریضہ سرانجام دینے کے بجائے حق کو چھپانے کے مجرم بنے ہوئے ہیں۔ اس جرم کی وجہ سے ہم پر عذاب کے کوڑے مختلف صورتوں میں برس رہے ہیں، لیکن پھر بھی ہم خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کو تیار نہیں۔ یہ ایک فطری قانون ہے کہ کوئی چیز جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہو وہ اگر اس مقصد کو پورا نہ کرے تو اسے اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قلم لکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے، لیکن جب وہ لکھنا بند کردے اور اس سے اس کا اصل مقصد ہی حاصل نہ ہو رہا ہو

تو اُسے اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ امتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔

اگر امت عبادتِ رب پر عمل پیرا نہ ہو اور شہادتِ حق کا فریضہ انجام نہ دے تو اللہ کی نگاہ میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی اور اس پر اللہ کی لعنت اور پھٹکار پڑتی ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال یہود ہیں جن کے بارے سورہ بقرۃ آیت 61 میں فرمایا گیا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

"مسلط کردی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔"

یہود کو اللہ تعالیٰ نے کئی نعمتوں سے نوازا۔ اُنہیں فرعون جیسے جابر بادشاہ سے معجزانہ طور پر نجات دلوائی، اُن کے لئے صحرا میں بادلوں کا سائبان فراہم فرمایا، آسمان سے من وسلویٰ نازل فرمایا اور ایک چٹان سے پانی کے بارہ چشمے جاری فرما دیئے۔ اس قوم میں سینکڑوں نبیؑ تشریف لائے اور اُنہیں کئی کتابیں عطا کی گئیں۔ اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کی وجہ سے وہ دعویٰ کر بیٹھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کہ ہم تو اللہ کے بڑے چہیتے اور اس کی اولاد کی مانند ہیں! (سورہ مائدہ آیت 18)۔ اُنہوں نے اپنی دینی ذمہ داریاں ادا نہ کیں لہٰذا دنیا میں ذلت ورسوائی کی عبرتناک مثال بن گئے۔

بدقسمتی سے آج یہی مغالطہ ہمیں لاحق ہے کہ ہم اللہ کے محبوب نبیؐ کے اُمتی ہیں۔ بلاشبہ ہم بہترین اُمت ہیں لیکن شہادت علی الناس کے اعلیٰ مقصد کی وجہ سے۔ اگر ہم اپنے مقصد کو پورا کرنے کی جدوجہد نہیں کریں گے تو ضابطہ خداوندی کے مطابق رُسوا کردیے جائیں گے۔ آج اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ پورا ہو رہا ہے۔ جب تک ہم اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے، دنیا میں سربلند رہے۔ جب سے ہم نے اپنے اس مقصد کو فراموش کیا ہم زوال سے دوچار ہوگئے۔ اسپین میں ہم نے سات سو سال سے زائد حکومت کی، اب وہاں ہمارا نام ونشان باقی نہیں۔ 1967ء میں ہمیں یہود سے ذلت آمیز شکست ہوئی جو اللہ کی نگاہ میں ایک ذلیل قوم ہے اور

بیت المقدس اُن کے قبضہ میں چلا گیا۔ 1971 ءمیں ہندوؤں کے ہاتھوں شکست اور اس کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانا ہماری تاریخ کا المناک ترین باب ہے۔ پھر وہاں بھائیوں کے ہاتھوں بھائیوں پر جو مظالم کے پہاڑ توڑے گئے اور بھائیوں کے ہاتھوں بہنوں کی عصمت جس طرح پامال ہوئی، وہ ہمارے لئے انتہائی رسوائی اور ذلت کا باعث ہے۔ کیا یہ سب کچھ ہمارے لئے کسی درجہ میں عبرت کا ذریعہ بنا؟ کیا ہمارے دل میں رُجوع الی اللہ کی تحریک پیدا ہوئی؟ کیا توبہ کا جذبہ ہمارے دل میں ابھرا؟ کیا ہمیں اپنی حالت کو بدلنے کا احساس ہوا؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے اور ہمارے شب و روز جو پہلے تھے وہی اب بھی ہیں۔ باقی رہنے والے پاکستان میں جو فتنے اور تعصبات ہمارے سامنے ہیں، وہ بھی ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار نہیں کر سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں ذلت و رسوائی کا سب سے بڑا نشان مسلمان بن گئے ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ ہماری پیٹھوں پر عذابِ الٰہی کے کوڑے پڑ رہے ہیں اور یہ سب کچھ خدا کے قانون اور ضابطہ کے تحت ہو رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں اُس وقت تک ہرگز کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی جب تک ہم خود اپنے رویے کو نہیں بدلیں گے۔ اللہ کا ضابطہ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

”یقیناً اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک
وہ اپنی حالت کو خود نہ بدلے۔“ (سورۂ رعد آیت 11)

لہٰذا ہم میں سے ہر فرد کو شعوری طور پر یہ طے کر لینا چاہیئے کہ اُس کا مقصدِ زندگی عبادتِ رب اور شہادت علی الناس کے فریضہ کی ادائیگی ہے اور یہ مقصد تمام مفادات سے بلند و بالا اور مقدم رہے گا۔ جب تک ہماری صلاحیتیں اور اس مقصد کے لئے جدوجہد میں استعمال نہ ہوں گی، ہماری افسوسناک صورتِ حال نہیں بدلے گی۔

قرآنِ حکیم کا تیسرا تقاضا -- اِقامتِ دین

''عبادتِ رب'' اور ''شہادت علی الناس'' کے بعد قرآنِ حکیم کا مسلمانوں سے تیسرا تقاضا ''اقامتِ دین'' ہے یعنی دین کا قیام، دین کا غلبہ، دین کو بحیثیت نظامِ زندگی بالفعل قائم کر دینا۔ اس تقاضہ کا ذکر سورۂ شوریٰ آیت 13 میں آیا ہے:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ
إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ

''(اے مسلمانو!) اُس (اللہ) نے تمہارے لئے مقرر کی ہے دین کے بارے میں وہی (ذمہ داری) جس کی وصیت کی تھی اس نے نوحؑ کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو کہ اس دین کو قائم کرو اور اس کے حصے بخرے نہ کرو۔''

اس آیت میں ''شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ'' کے الفاظ کے ذریعہ ہر زمانہ کی اُمتِ مسلمہ پر اِقامتِ دین کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ پھر ''وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ'' میں اس فریضہ کا بیان ہے نبی اکرم ﷺ کے لئے۔ اس کے علاوہ مزید چار رسولوں کا ذکر ہے کہ اِقامتِ دین کی ذمہ داری اِن سب کے لئے بھی تھی۔

تمام انبیاء ورسل کا دین ایک ہے:

اس آیہ مبارکہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کے لئے دین کے حوالہ سے وہی ذمہ داری مقرر کی ہے جو اس سے پہلے دیگر جلیل القدر رسولوں کے لئے مقرر کی تھی۔ اِس آیت میں پانچ رسولوں کا ذکر ہے یعنی حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ۔ یہ پانچ امتیازی شان کے حامل رسول ہیں۔ اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ سورۂ احقاف کی آخری آیت میں ''اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ

الــرُّسُــل‘‘ یعنی باہمت رسولوں کے الفاظ انہی پانچ رسولوں کے لئے آئے ہیں۔آیت زیرِ مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اِن تمام رسولوں کا دین ایک ہی رہا ہے اوراُن سب کا مقصد اِس دین کو قائم کرنا تھا۔

لفظ ’’دین‘‘ کا مفہوم:

’’دین‘‘ کا لفظ ’’عبادت‘‘ اور ’’شہادت‘‘ کے الفاظ کی طرح تعلیماتِ اسلامی میں بڑا اہم ہے اور اس کے صحیح فہم پر ہی قرآنِ حکیم کی دعوت کا درست مطلب سمجھنا منحصر ہے۔ لفظ ’’دین‘‘ کا بنیادی مفہوم ہے بدلہ یعنی جزا وسزا۔سورہ ٔ فاتحہ میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا ترجمہ ہے بدلہ کے دن کا مالک!۔اسی جزا وسزا کے بنیادی تصور سے عربی زبان میں لفظ ’’دین‘‘ کے مفہوم میں انتہائی وسعت پیدا ہوتی ہے۔جزا وسزا کسی ضابطہ اور قانون کے تحت ہی ہوتی ہے۔کسی ضابطہ اور قانون کی پابندی پر انسان جزا کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اس کی خلاف ورزی پر سزا کا۔اِسی لئے سورہ ٔ یوسف آیت 76 میں دین کا لفظ قانون کے معنی میں آیا ہے:

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ

’’اُن (یعنی یوسفؑ) کے لئے ممکن نہ تھا اپنے بھائی کو روکنا (مصر میں)

بادشاہ کے قانون کے مطابق۔‘‘

قانون اور ضابطہ تشکیل پاتا ہے نظام کے تحت۔اِسی لئے لفظ دین قرآنِ حکیم میں نظام کے معنی میں بھی آیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

’’اوراُن سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور مکمل طور پر نظام اللہ ہی کا ہوجائے۔‘‘ (سورہ ٔ انفال آیت 39)

سورہ ٔ مومن آیت 26 میں فرعون کا اپنی قوم سے خطاب کے دوران قول نقل ہوا:

إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ

مجھے ڈر ہے کہ وہ (یعنی موسیٰ) بدل دے گا تمہارے نظام کو

جس نظام میں اللہ کے عطا کردہ قوانین کی اطاعت ہو وہ ''دین اللہ'' ہے، جس نظام میں عوام کے نمائندوں کے بنائے ہوئے قوانین نافذ ہوں وہ دینِ جمہور ہے اور جس نظام میں بادشاہ کو بڑا مان کر اُس کے فرامین کی اطاعت کی جائے وہ دینُ المَلِک ہے۔ اس اعتبار سے دین کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ:

''ایک پورا نظامِ زندگی اور مکمل ضابطۂ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو قانون ساز (**law giver**) اور حاکم (**sovereign**) مان کر اُس کی جزا کی اُمید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ قانون اور ضابطہ کے مطابق کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے۔''

آیت زیرِ مطالعہ میں دین سے مراد ''دین اللہ'' ہے جس کا ذکر سورۂ نصر میں اس طرح آیا:

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿﴾ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا ﴿﴾

''جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح نصیب ہو گئی اور (اے نبی ﷺ) آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔''

''دین اللہ'' یہ ہے کہ صرف اللہ کو بڑا اور حاکم تسلیم کر کے اسی کی جزا کی اُمید رکھتے ہوئے اور اسی کی سزا سے خوف کھاتے ہوئے بصرف اسی کی عطا کردہ شریعت کے مطابق اپنے انفرادی واجتماعی معاملات کو سر انجام دیا جائے۔ بالفاظ دیگر اپنی پوری زندگی میں صرف اور صرف اسی کی کامل اطاعت کو لازم کر لیا جائے۔ اسی رویہ اور طرزِ عمل کا نام ہے اللہ کے دین کے تحت زندگی گزارنا۔ قرآنِ حکیم میں اسی کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (سورہ بقرۃ آیت **208**)

''اے اہلِ ایمان اسلام (یعنی اللہ کی اطاعت) میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!''

ہر دین غلبہ چاہتا ہے :

"دین" کا جو تصور ہمارے سامنے آیا ہے، اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ دین اپنے مفہوم کے اعتبار سے اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دین درحقیقت دین ہے ہی نہیں جو غالب نہ ہو۔ ہندوستان پر انگریز کے دور میں جس دین کی اصل حکمرانی تھی وہ "دینِ انگریز" تھا۔ وائسرائے ہند کو تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت حاصل تھی اور اصل حاکم برطانوی دارالعوام تھا۔ مسلمانوں کو عبادات بجالانے کی اجازت تھی لیکن اجتماعی زندگی میں دینِ اسلام غالب نہ تھا۔ اس صورتِ حال کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اسلام کیا ہے ؟ :

آج ہماری اکثریت مذہب اور دین کے فرق سے واقف نہیں ہے۔ وہ اسلام کو بھی دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب سمجھتی ہے حالانکہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ قرآنِ حکیم میں اور پورے کے پورے ذخیرۂ احادیث میں اسلام کے لئے مذہب کی نہیں بلکہ دین کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ نے فرمایا: وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا --میں نے تمہارے لئے اسلام کو پسند کرلیا بطور دین (سورۂ مائدہ آیت 3)۔ مذہب کا تعلق ایک انسان کی صرف انفرادی زندگی سے ہے جبکہ دین زندگی کے انفرادی و اجتماعی دونوں گوشوں سے بحث کرتا ہے۔ مذہب کا تعلق چند عقائد، ان عقائد کے تحت چند عبادات اور خوشی وغمی کے حوالے سے کچھ معاشرتی رسومات سے ہوتا ہے۔ دین ان تین اُمور کے علاوہ اجتماعی زندگی کے تین اہم گوشوں یعنی سیاست، معیشت اور معاشرت کے بارے میں بھی رہنمائی دیتا ہے۔ عیسائیت، یہودیت، ہندومت وغیرہ مذاہب ہیں کیونکہ یہ زندگی کے اجتماعی گوشوں کے حوالے سے کوئی رہنمائی نہیں دیتے۔ صرف اور صرف اسلام دین ہے جو زندگی کے ہر گوشے

کے حوالے سے واضح رہنمائی دیتا ہے۔ اسی لئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

''بلاشبہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔''(سورۃ آلِ عمران آیت 19)

موجودہ صورتِ حال :

اللہ کے نزدیک تو دین صرف اسلام ہی ہے لیکن اس وقت دنیا میں غالب تصور سیکولرزم کا ہے۔ اس کے تحت افراد انفرادی زندگی میں مختلف مذاہب پر عمل کر سکتے ہیں لیکن اجتماعی زندگی میں اللہ کے احکامات کو سند یا ذریعۂ رہنمائی نہیں بنایا جا سکتا اور اجتماعی معاملات، عوام کے نمائندوں کی کثرتِ رائے سے طے ہوتے ہیں۔ گویا سیکولرزم کے تحت ایک طرف ہمہ مذہبیت ہے اور دوسری طرف لادینیت، یعنی انفرادی زندگی میں مختلف مذاہب پر عمل ممکن ہے لیکن اجتماعی زندگی میں اللہ کے احکامات کو قبول نہیں کیا جاتا۔ یہ تاریخِ انسانی میں نوعِ انسانی کی اللہ تعالیٰ سے بدترین بغاوت ہے جس میں اُس کی بڑائی کو عبادت خانوں تک محدود کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اجتماعی معاملات میں اللہ کو نہیں جمہور کے نمائندوں کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا گیا ہے کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز؟ اسمبلی کی اکیاون فیصد اکثریت کو ہر بات کے فیصلہ کا اختیار حاصل ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ دو مردوں کی شادی کے جواز کا قانون پاس کردے۔ وہ چاہے تو سڑکوں پر، پارکوں، کلبوں اور بازاروں میں، فلموں اور ڈراموں میں اور اسٹیج پر عریانی یہاں تک کہ جنسی فعل تک کو جائز قرار دے دے۔ اسے اختیار ہے کہ سود، سٹہ، لاٹری، شراب نوشی اور اسی طرح کے کبیرہ گناہوں کو حلال قرار دے دے۔

ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی اسلام کو دین نہیں محض مذہب سمجھتی ہے اور انفرادی سطح پر چند مذہبی شعائر پر عمل کر کے مطمئن ہے۔ ہم اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ کے حکمِ قرآنی کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ ہم نے نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے تحریکِ پاکستان

چلائی تھی اور پاکستان قائم کیا تھا لیکن یہاں بھی اپنی روح کے اعتبار سے سیکولرزم ہی نافذ ہے۔ہم اِس ملک کے مسائل کا حل بھی اِسلام کے نفاذ میں نہیں بلکہ جمہوریت کی بحالی میں سمجھتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ہدایت اور شریعت سے آزاد یہ ''جمہوریت'' اللہ سے بغاوت اور سرکشی فکر سے لے کر عمل تک کفر وشرک اور گویا ایک لعنت ہے۔

دین اور شریعت کا فرق:

دین کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد ضروری ہے کہ ہم دین اور شریعت کے فرق کو بھی سمجھ لیں۔دین ایک ضابطہ اور اصول ہے جس کے مطابق حاکم صرف اللہ ہے اور اُس کی عطا کردہ تمام تعلیمات اور احکامات کی اطاعت لازم ہے۔جبکہ شریعت عملی زندگی کے تفصیلی احکامات پر مشتمل ہوتی ہے۔دین ہر دور میں ایک ہی رہا لیکن شریعت میں حالات کے بدلنے، انسانی ذہن کے ارتقاء، تہذیب وتمدن اور وسائل و ذرائع کی ترقی کی وجہ سے تبدیلی ہوتی رہی۔حضرت موسیٰؑ کی شریعت اور تھی اور حضرت محمد ﷺ کی اور۔مثلاً دونوں شریعتوں میں نمازوں کی تعداد اور اوقات اور روزہ کے احکامات میں فرق بہت واضح ہے۔

دین اور شریعت کے فرق کو آپ دورِجدید کی دو اصطلاحوں کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔کسی بھی ملک کا ایک تو ''دستور'' **(Constitution)** ہوتا ہے، جس میں یہ متعین ہوتا ہے کہ حاکم کون ہے اور اُس کی حاکیت کس طرح استعمال (**Channelize**) ہوگی، حاکیت کے تحت قانون بنانے کا طریقہ کیا ہوگا، قوانین میں ردوبدل کیسے ہوگا، ملک میں عدلیہ اور انتظامیہ کے مختلف شعبوں کا باہمی ربط کیا ہوگا، مختلف مناصب اور اداروں کے لئے احتساب کا نظام کیا ہوگا؟ کسی بھی ملک کا دستور بناتے ہوئے اِس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کی دفعات پائیدار اور مستحکم ہوں۔ان میں بار بار کی تبدیلی مناسب نہیں ہوتی، اسی لئے ان میں تبدیلی کے طریق کار کو بڑا ہی مشکل رکھا جاتا ہے۔

ہر ملک میں دستور کے تحت قوانین بنتے رہتے ہیں۔ان کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ان میں

حسبِ ضرورت آسانی سے ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو صدارتی فرامین یعنی Ordinances کے ذریعہ سے بھی قوانین میں ردوبدل ہوجاتا ہے لیکن جمہوری ممالک میں تو بہرحال یہ اختیار اسمبلی کے پاس ہوتا ہے کہ وہ اکیاون فیصد کی اکثریت سے قانون بنا بھی سکتی ہے اور اس میں ردوبدل بھی کرسکتی ہے۔

اب یوں سمجھئے کہ ہمارے دین کے نظام میں دستور کی جگہ تو "دین" کی اصطلاح ہے اور قانون کی جگہ "شریعت" کی اصطلاح ہے۔دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ حاکم کون ہے؟ حاکیت کس کی ہے؟ قانون کس کا چلے گا؟ حاکیت پر کس طرح عمل ہوگا اور حاکم کے نمائندے کی حیثیت کیسے حاصل ہوگی؟ یہ تمام اُمور ہمیشہ سے طے شدہ ہیں اور ان میں کبھی کوئی فرق نہیں رہا کہ حاکم صرف اللہ ہے، سورۂ یوسف آیت 40 کے مطابق "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" (حکم اللہ ہی کے لئے ہے)۔ اس کی طرف سے ملنے والا ہر قانون واجب العمل ہے اور اسے لے کر آنے والے نمائندے اُس کے رسول ہیں۔ اُس کے قانون کی جو تعبیر رسول کریں گے اُسے قبول کرنا اور اُس کی روشنی میں اپنے معاملات طے کرنا لازمی ہے۔ جن معاملات میں اللہ کی نازل کردہ وحی یا ارشاداتِ رسول سے واضح دلیل موجود نہ ہو، انہیں دین کی روح کے تحت باہمی مشاورت سے طے کیا جاسکتا ہے، لیکن جو واضح احکامات اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے دیے ہیں اُن سے انحراف کی اجازت نہیں۔ اس دین کے تحت رسول مختلف امور کے لئے جو بھی عملی رہنمائی دیں گے وہ شریعت ہے۔

اقامتِ دین کا حکم:

لفظ دین کو سمجھنے کے بعد اب ہم آیت زیرِ مطالعہ میں قرآن کے اس تقاضہ کو سمجھتے ہیں کہ "اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ" "دین کو قائم کرو اور اس کے حصے بخرے نہ کرو!"۔ دین اس لئے دیا گیا ہے کہ اسے نافذ کیا جائے اور نہ کہ اس میں سے محض چند اجزاء پر عمل کر کے اس کے

حصے بخرے کر دیے جائیں۔ وہ دستور اور قانون بے معنی ہے جو کہیں نافذ نہیں۔ لہٰذا اللہ کی عطا کردہ کتاب دستور کو محض حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ نہ بنالو یا اس کا احترام بس اتنا نہ ہو کہ اسے ریشمی جزدان میں لپیٹ کر رکھ لو اور ہاتھ سے گر جائے تو اس کے برابر اناج تول کر دے دو، کہیں کوئی تقریب ہو، چاہے کسی بینک، سینما، کلب، بار یا ریس کورس کی افتتاحی تقریب ہو، تو اس کی تلاوت کرالو! معاذ اللہ، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ یہ دین تو اس لئے دیا گیا ہے کہ ہر سطح پر اس کی تعلیمات نافذ کی جائیں۔

ہمارا منافقانہ طرزِ عمل:

دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان موجود ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اصل دستور اور قانون اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول ﷺ کی سنت ہے، لیکن اُن کا عمل اس دعویٰ کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا عطا کردہ دستور و قانون اُن کی عملی و اجتماعی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اُن کے ہاں قرآن و سنت کے احکامات کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں۔ قرآنِ حکیم سے استفادہ بس حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کے لئے رہ گیا ہے اور رسول ﷺ کا ادب و احترام صرف درود و سلام اور زبانی اظہارِ محبت تک محدود ہو گیا ہے۔

ہمارا یہ طرزِ عمل پوری دنیا کے لئے باعثِ تعجب ہے کہ ایک طرف تو ہم اس بات کے دعویدار ہیں کہ ہمارا دستور، ہمارا قانون اور ہمارا ضابطۂ حیات اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے، ہر لحاظ سے کامل ہے اور دنیا کے ہر دستور سے افضل ہے۔ پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی پر عمل پیرا ہونے سے دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کامل ترین اور افضل ترین دستورِ حیات سے ہماری بے وفائی بھی دنیا سے مخفی نہیں ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران یہ بھی کہا گیا تھا کہ ''لوگ پوچھتے ہیں کہ پاکستان کا دستور کیا ہوگا؟ ہم اُن کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا دستور تو چودہ سو سال پہلے سے طے شدہ ہے!'' لیکن عملاً جو کچھ اب تک ہوا اور جو ہو رہا ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ قابلِ تعجب بات کیا ہوگی کہ جو ملک

اس اصول پر قائم ہوا تھا کہ اس کا دستور اور ضابطۂ حیات کتاب وسنت ہوگا لیکن یہاں قرآن وسنت کے کسی ایک ضابطہ پر بھی صحیح روح کے ساتھ عمل نہیں ہوا۔ انگریز کے دور میں جو عائلی قوانین (Family laws) شریعت کے مطابق نافذ تھے ہم نے اُن کی بھی صورت مسخ کر کے رکھ دی۔

''اقامت'' کا مفہوم:

''اَقِیْمُوا الدِّیْنَ'' کا ترجمہ ''قائم کرنا'' بھی کیا گیا ہے اور ''قائم رکھنا'' بھی۔ نتیجہ کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دین پہلے سے قائم اور غالب ہے تو اسے اس حالت پر برقرار رکھنا اقامتِ دین ہے۔ لیکن اگر دین بالفعل قائم نہیں ہے تو اسے دنیا میں قائم اور غالب کرنے کی جدوجہد کرنا اقامتِ دین کا تقاضا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ''اقامت'' کا مفہوم ''سیدھا رکھنا'' ہے، یعنی حکم دیا جا رہا ہے کہ اس دین کی کسی چیز کو بدلو نہیں! تمہیں اس میں کسی کمی بیشی اور ترمیم کا اختیار حاصل نہیں، یہ دین تمہیں بطور امانت دیا گیا ہے اور اس کو جوں کا توں رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے!۔ ''اقامتِ دین'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے، لیکن سیدھی سی بات ہے کہ اسے جوں کا توں رکھنا کس مقصد کے لئے ہوگا؟ اسے صرف کتابوں میں صحیح صحیح محفوظ کر لینا تو مقصود نہیں ہے۔ اگر یہ دین زندگی کے معاملات سے متعلق ہے تو اس کی حفاظت بھی اس کو قائم کرنے لئے مقصود ہے تا کہ تمام معاملات اللہ کی مرضی کے مطابق طے پائیں۔ چنانچہ ''اَقِیْمُوا الدِّیْنَ'' کا مفہوم یہ ہوگا کہ دین کو قائم کرو، اس کی ٹھیک ٹھیک حفاظت کرو اور اپنے سارے معاملات اس کے مطابق طے کرو۔ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ کا مفہوم یہ بھی ہے کہ دین میں تفریق نہ کرو یعنی ایسا نہ ہو کہ اس کے کچھ اجزاء پر تو عمل ہو اور باقی نظر انداز کر دو۔ اسی طرح اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ دین کے غلبہ کے مشن کے حوالہ سے تم سب متحد ہو جاؤ اور اس حوالہ سے تمہارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔

الحمدللہ! مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی مالکِ حقیقی اور حاکم

ہے۔ اللہ کی اطاعت ہم سب پر لازم ہے۔ یہ اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ذریعہ ہوگی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔'' (سورۂ نساء آیت 80)

اللہ کا عطا کردہ دستور و قانون ہم تک رسول ﷺ کے ذریعہ پہنچا ہے۔ اب اِس دستور و قانون کے نفاذ یعنی اقامتِ دین کے حوالے سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اِس مشن میں اختلاف کا شکار ہونے اور اس میں اپنی رائے سے جداگانہ راہیں نکالنے سے یہ کہہ کر منع فرما دیا گیا کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔

فقہی اختلافات 'تفرقہ' نہیں:

فقہی معاملات میں حنفی، شافعی یا دوسرے ائمہ فقہاء کی آراء میں کہیں فرق ہے تو یہ دین کا فرق نہیں بلکہ صرف شریعت اور قانون کی تعبیر میں آراء کا فرق ہے۔ دین تو ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا۔ اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر ائمہ فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ مختلف امور میں فقہی اختلاف صرف قرآن و سنت کی تعبیر کا ہے۔

دین حق کا قیام مشرکین پر بھاری ہے:

آیت زیر مطالعہ میں آگے فرمایا گیا:

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ

''(اے نبیؐ) بھاری ہے مشرکوں پر وہ بات جس کی آپ انہیں دعوت دے رہے ہیں۔''

مکی سورتوں کے عام اسلوب کے مطابق یہاں پر خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ سے ہے، لیکن درحقیقت ہر دور کے مسلمان اِس کے مخاطب ہیں جو اِس دعوت کے داعی بن کر کھڑے ہو جائیں۔ یہاں یہ حقیقت واضح کی جارہی ہے کہ ہر دور میں مشرکین عادلانہ نظام کے قیام کو

اپنے مفادات کے لئے خطرہ سمجھیں گے اور اس کی بھرپور مخالفت کریں گے۔ ذاتی طور پر مشرکین کی طرف سے ہر طرح کے مخالفانہ ردِّعمل کے لئے تیار رہا جائے۔

ہر دور میں شرک کے دو نظام موجود رہے ہیں۔ایک سیاسی شرک اور دوسرا مذہبی شرک۔

سیاسی شرک:

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی انسان خود خدائی کا دعویدار بن بیٹھے کہ مرضی میری چلے گی، میں نہیں جانتا کہ خدا کا کیا حکم ہے اور رسول کیا کہتا ہے؟ اقتدار کا مالک میں ہوں لہٰذا حکم صرف میرا چلے گا! اس سیاسی شرک کا نام ملوکیت اور آمریت ہے۔اس کی بدترین مثال فرعون اور نمرود نے قائم کی۔سیاسی شرک کی دوسری صورت، جو موجودہ دور میں بہت عام ہے، یہ ہے کہ کسی ملک کے عوام اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا انکار کردیں۔وہ کہیں کہ اللہ اور رسول کو ماننا ایک انفرادی معاملہ ہے۔جو انہیں مانتے ہیں وہ مسجدوں، مندروں اور کلیساؤں میں اُن کی اطاعت کرلیں۔ملک کا قانون تو عوام کی اکثریت کی مرضی کے مطابق بننا چاہیے۔اس کا نام ہے جمہوریت اور یہ بھی ایک بدترین سیاسی شرک ہے۔سیاسی شرک کی تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی ایک قوم دوسری قوم کو محکوم بنالے کہ ہم تمہارے آقا ہیں، لہٰذا مرضی ہماری چلے گی۔ جیسے انگریز قوم نے ہمیں اپنا محکوم بنالیا اور ہمیں بس اس قدر مذہبی آزادی دی کہ ہم نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی اپنے دین کے مطابق کرلیں۔ملکی قانون (**Law of the land**) اُن کا تھا۔مرضی اور پسند تاجِ برطانیہ کی چلتی تھی اور وائسرائے ہند اس کا نمائندہ تھا۔یہ سیاسی شرک کی تیسری صورت ہے۔چنانچہ سیاسی طور پر کوئی آمر، کوئی بادشاہ یا کوئی قوم حاکمیت کے مقام پر فائز ہوجائے اور ملک کے تمام معاشی ذرائع و وسائل اور تمام قومی دولت کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق استعمال کرے تو یہ سیاسی شرک ہے۔

مذہبی شرک:

چند بڑے ہوشیار اور چالاک لوگ مذہبی پیشوا بن کر انسانوں کو تصور دیتے ہیں کہ تم گناہ گار

ہو۔اللہ تک تمہاری دعائیں نہیں پہنچ سکتیں لہٰذا اس کے لئے واسطوں اور وسیلوں کی ضرورت ہے۔کہیں یہ نام نہاد پیشوا خود خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ بن جاتے ہیں اور کہیں دیوی اور دیوتاؤں کے نام پر مندر بنا کر یا اولیاء و صلحاء کے نام پر مقبرے اور درگاہیں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ اُن کے نام پر جو نذرانے آئیں، نذریں اور نیازیں چڑھائی جائیں ان سے اپنی خواہشاتِ نفس پوری کر سکیں۔ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں خوش کرو گے تو یہ دیوی دیوتا تم سے راضی ہو جائیں گے اور یہ بزرگ تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس طرح تمہاری مرادیں پوری ہوں گی اور اللہ بھی تم سے خوش ہو جائے گا۔

سیاسی شرک کے پیشوا بادشاہوں کے روپ میں ***Divine rights of kings*** کا تصور دے کر عوام سے خراج وصول کرتے رہے۔مذہبی شرک کے پیشوا پنڈت، پادری، پروہت، پجاری اور پیر بن کر عوام کی محنت کی کمائی سے نذرانے اور چڑھاوے وصول کرتے رہے اور دونوں استحصالی عناصر کا ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا۔ بادشاہ، مذہبی پیشواؤں کو ***His Holiness*** کی سند دیتے رہے اور مذہبی پیشوا بادشاہوں کو ***Defenders of the faith*** کا اعزاز دیتے رہے۔

اسلام سیاسی شرک کے رد کے لئے حاکم صرف اللہ کو قرار دیتا ہے، انسانوں کو انسان کی غلامی سے نجات دلا کر صرف اور صرف اللہ کی غلامی کے رنگ میں رنگ دیتا ہے اور بادشاہت کے بجائے خلافت کا تصور دیتا ہے۔ اسلام نے مذہبی شرک کے سدباب کے لئے توحید کا ایسا تصور دیا کہ خالق و مخلوق میں حائل تمام واسطوں اور وسیلوں کی نفی کر دی:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

سورۂ بقرہ آیت **186** میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جب بھی کوئی دعا کرنے والا اللہ سے مانگتا ہے تو اللہ نہ صرف اس کی پکار کو سنتا ہے بلکہ اس کا جواب دیتا ہے۔

اب جن لوگوں کے مفادات پر اسلام کی انقلابی دعوت کی ضرب پڑتی ہے، اُن کے لئے اس

دعوت کا پھیلانا گوارہ ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ بھاری ہے اے نبی ؑ مشرکین پر وہ (دین کا غلبہ) جس کی طرف آپ ؐ دعوت دے رہے ہیں۔

مصلح اور رسول کی دعوت کا فرق :

یہاں یہ بات بھی وضاحت سے سمجھ لیجئے کہ ایک رسول اور مصلح کی دعوت میں بڑا بنیادی فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف واعظ اور معلّمِ اخلاق بن کر کھڑا ہو تو اس کی بات لوگوں پر اتنی گراں نہیں گزرتی جتنی اُس شخص کی بات جو اِس بات کا داعی بن کر اٹھے کہ میں اس پورے نظامِ باطل کو، جو غیر اللہ کی اطاعت پر قائم ہے بالکل نیست و نابود کردوں گا اور اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام قائم کروں گا۔ چونکہ غیر اللہ کی اطاعت اور مشرکانہ بنیادوں پر قائم نظامِ باطل سے کچھ لوگوں کے سیاسی و معاشی مفادات اور مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اب اُن کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر یہ نظام ختم ہوا تو ہمارے مفادات پر ضرب پڑے گی، ہماری چودھراہٹ نہیں رہے گی اور ہمارا وقار اور احترام خاک میں مل جائے گا۔ اس لئے توحید پر مبنی اسلام کے عادلانہ نظامِ اجتماعی کے قیام کی دعوت مشرکانہ نظام کے سرداروں کو برداشت نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اگر آپ کسی جزوی اصلاح کی دعوت لے کر اُٹھیں، ریفارمر کی حیثیت اختیار کریں یا دین کی محض وہ باتیں پیش کریں جن سے کسی کے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو تو پھر آپ کی کسی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوگی۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو پھولوں کے ہار پہنائے جائیں اور ہر محفل میں آپ کا شاندار استقبال کیا جائے۔

اہلِ ایمان کے لئے تسلی :

سورہ شوریٰ کی آیت 13 کے آخری حصہ میں فرمایا :

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

"اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اُسے اپنی طرف آنے کی ہدایت دیتا ہے جو رجوع کرتا ہے (اللہ کی طرف)۔"

آیتِ کریمہ کے اس ٹکڑے کے پس منظر میں اس کشمکش اور تصادم کی جھلک نظر آتی ہے جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ اور مشرکین کے درمیان جاری تھا۔ مشرکین کو کسی درجہ میں یہ گوارا نہیں کہ مشرکانہ نظام ختم ہو اور پوری کی پوری زندگی، ایک اللہ کی اطاعت کے نظام کے تحت آجائے۔ چنانچہ وہ مزاحمت اور مخالفت پر کمربستہ ہیں اور ان کی دن رات یہ کوشش ہے کہ دینِ حق کا چراغ گل کر دیا جائے۔ ان انتہائی مایوس کن حالات میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کو تسلی دی جارہی ہے کہ اس شدید مزاحمت ومخالفت اور تشدد سے دل برداشتہ نہ ہوں، اللہ تعالیٰ یقیناً راستہ کھولے گا اور بہت سے لوگوں کو، جنہیں وہ چاہے گا، اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا۔ اس کے علاوہ جو لوگ بھی حق کے طالب ہیں، اُن کو بھی ہدایت سے نوازے گا۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے!) کی ایک مثال حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کا قبولِ اسلام ہے۔ آپؓ توحید اور شرک کی کشمکش سے بے نیاز روز و شب اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے، جن میں سب سے زیادہ نمایاں شوق تیر اندازی اور شکار کا تھا۔ ایک روز ابوجہل نے رسول اللہ ﷺ سے زیادتی کی۔ شام کو شکار سے واپس لوٹے تو اُن کی کنیز نے انہیں اس زیادتی کا ماجرا سنایا۔ قرابت داری کے جذبے نے جوش کھایا۔ اُسی وقت جا کر اپنی کمان ابوجہل کے سر پر دے ماری۔ یہی جذبہ اُن کے اسلام قبول کرنے کا ذریعہ بن گیا اور آپؓ نبی اکرم ﷺ کے جاں نثاروں میں شامل ہو گئے۔ بارگاہِ نبوی ﷺ سے آپؓ ''اَسَدُ اللّٰهِ وَ اَسَدُ رَسُوْلِهٖ'' (اللہ کے شیر اور اُس کے رسولؐ کے شیر) اور ''سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ'' کے القابات سے سرفراز ہوئے۔ اسی کی دوسری مثال حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو دعوتِ حق دیتے ہوئے چھ برس گزر چکے تھے مگر اُن پر کوئی اثر نہ تھا بلکہ اس کے برعکس اُن کو غصہ تھا کہ اسلام کی دعوت نے قریش کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اسلام کی دعوت سے بیزاری اس قدر بڑھی کہ ایک روز تلوار لے

کر آپ ﷺ کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالت پیدا فرما دیئے کہ دل موم ہو گیا۔ اب اُن کی یہ شان قرار پائی کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن الخطاب ہوتے!(جامع ترمذی)۔

''يَهْدِيْ إِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ''(اللہ اُسے اپنی طرف آنے کی ہدایت دیتا ہے جو رجوع کرتا ہے اللہ کی طرف) کے الفاظ میں رہنمائی ہے کہ جن کے دلوں میں حق کی سچی طلب ہوتی ہے اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت کا راستہ ضرور دکھادے گا۔شرک کے انتہائی تاریک اندھیروں میں بھی ایسی سعید روحیں موجود ہوتی ہیں جو حق کی تلاش میں بے چین ہوتی ہیں۔حضرت ابو بکر صدیقؓ اس کی سب سے نمایاں مثال ہیں۔پھر حضرت علیؓ،حضرت عثمانؓ،حضرت سعیدؓ بن زید، حضرت ابوعبیدہؓ ابن الجراح،حضرت عبد الرحمانؓ بن عوف، حضرت طلحہؓ،حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص جیسے صحابہؓ جو عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں، اسی رجوع الی اللہ کی وجہ سے دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے۔حضرت سلمان فارسیؓ کے ایمان لانے کے واقعہ پر غور کیجئے۔طلبِ حق میں کہاں سے روانہ ہوئے، کن کن منزلوں پر ٹھہرے اور پھر کس طرح منزلِ مقصود تک پہنچے۔

تفرقہ کا اصل سبب:

سورہ شوریٰ کی آیت **13** کے بعد آیت **14** میں فرمایا:

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ

''اور انہوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا تھا، صرف اس لئے کہ وہ ایک دوسرے پر اپنا غلبہ چاہتے تھے۔''

اس آیت میں سبب بیان کیا جارہا ہے کہ جب دین ایک ہے تو پھر تفرقہ کیوں ہوا؟ یہودیت نے ایک علیحدہ راہ کیوں نکالی اور عیسائیت نے علیحدہ کیوں؟ یہ سوال ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے

کہ اہلِ کتاب توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد اور شریعت پر عمل کی اہمیت سے واقف تھے تو انہوں نے اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کی دعوت کو قبول کیوں نہ کیا۔ مشرکین مکہ کی اس دعوت کے حوالے سے مخالفت سمجھ میں آتی ہے کہ وہ کتاب وشریعت کی تعلیمات سے ناواقف تھے اور یہ دعوت اُن کے مفادات کے لئے نقصان دہ تھی۔ لیکن اہلِ کتاب اس دعوت کی مزاحمت ومخالفت میں مشرکین سے بھی زیادہ شدید کیوں ہوگئے؟ اس آیت میں بتایا گیا کہ اہلِ کتاب کے تفرقہ کا سبب تھا "بَغْيًا بَيْنَهُمْ" یعنی آپس کی ضد، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش اور اپنا غلبہ قائم کرنے کی خواہش۔ اگر وہ نبی اکرم ﷺ کو نبی اور رسول مان لیتے تو اُن کی مذہبی چودھراہٹ ختم ہو جاتی۔

قرآنِ مجید کی شہادت یہ ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (جن کو ہم نے کتاب عطا فرمائی، وہ انہیں (رسول اللہ ﷺ کو) اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہوں - البقرۃ: 146، الانعام: 20)۔ اہلِ کتاب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ وہی آخری نبی ہیں جن کی بشارتیں اور پیشن گوئیاں وہ سنتے چلے آرہے تھے اور جن کی آمد کے وہ منتظر تھے۔ اسی طرح عیسائی بھی آپ ﷺ کی آمد کی پیشن گوئیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایک عیسائی راہب نے حضرت سلمان فارسیؓ کو یہ اطلاع دی تھی کہ جنوب میں کھجوروں کے جھنڈ میں آخری نبی کا ظہور ہوگا، اگر حقیقی ہدایت اور حق کی طلب ہے تو وہاں پہنچو اور اُن کی آمد کا انتظار کرو۔ یثرب اور اس کے قرب وجوار میں رہنے والے یہودی، اوس وخزرج کے قبیلوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے اور ہم جب اس کے ساتھ ہوکر تم سے لڑیں گے تو تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ لیکن جب آخری نبی ﷺ کا ظہور ہوا اور وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے آئے تو اُن کی عزتِ نفس پر یہ چوٹ پڑی کہ نعمتِ نبوت بنی اسرائیل سے کیوں چھن گئی اور وہ نسلی تعصب اور ضد کی وجہ سے تفرقہ میں پڑ گئے۔

''اجلِ مسمّٰی'' کا قانون :

سورہ شوریٰ کی آیت 14 میں تفرقہ کا سبب بیان کرنے کے بعد فرمایا :

وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ

''اور اگر ایک بات آپؐ کے رب کی طرف سے طے نہ ہو جاتی ایک وقتِ مقرر تک
تو اُن کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا!''

آیت کے اِس حصہ میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ کو تسلی دی جارہی ہے کہ وہ اہلِ کتاب کے طرزِ عمل سے غمگین نہ ہوں۔ اللہ کا ضابطہ ہے کہ دنیا میں نافرمانوں کو مہلت دیتا ہے تاکہ توبہ کر لیں یا اپنی حسرتیں پوری کر لیں۔ ہر کام کے انجام کے لئے اللہ کی مقرر کردہ ایک مدت ہوتی ہے۔ پھر اللہ کا فیصلہ آ کر رہتا ہے اور حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

قرآن کے آئینے میں ہماری تصویر :

سورہ شوریٰ کی آیت 14 میں مزید فرمایا گیا :

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ

''اور اُن کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ درحقیقت اس کے بارے
میں سخت الجھن میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں''

آیت کے اِس حصہ میں بیان کیا گیا کہ اللہ کی کتابوں کے حامل جب دین کی دعوت کے حوالہ سے ضد اور ہٹ دھرمی کی روش پر اتر آئیں تو بعد میں آنے والوں کا کتاب کی تعلیمات پر سے اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کیا کتاب کی تعلیمات اپنے ماننے والوں پر یہ اثر ڈالتی ہیں کہ وہ آپس کی ضد میں پڑ کر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں۔

آج یہی کیفیات ہماری بھی ہیں۔ اِس بات پر ہمارا حقیقی یقین نہیں کہ قرآن واقعی اللہ کی کتاب ہے، ورنہ یہ ناممکن ہے کہ ایک طرف ہمارا یہ یقین ہو کہ یہ اللہ کا کلام ہے جس کے حضور ہمیں پوری زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے حاضر ہونا ہے اور دوسری طرف ہم اِس کے

پڑھنے، سمجھنے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے اعراض کریں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمیں یہ یقین ہو کہ یہ کتاب ہماری زندگی کے ایک ایک گوشہ کے لئے رہنمائی فراہم کرتی ہے اور پھر بھی اس سے رہنمائی لینے کی ہمیں ضرورت ہی محسوس نہ ہو؟ ہم سب کچھ پڑھیں، انگریزی ادب میں اسکالر ہو جائیں، دنیا بھر کے علوم و فنون حاصل کرلیں، ڈاکٹری اور انجینیئرنگ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں زندگی کے کئی قیمتی سال لگا دیں، لیکن اگر عربی پڑھنے اور قرآنِ حکیم کو سمجھنے کی توفیق نہ ہوئی ہو تو یہ دعویٰ کیسے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس میں زندگی کے ہر مسئلہ کا حل ہے۔

رسالت کا ایک اہم تقاضا: دعوت

اس کے بعد سورہ شوریٰ کی آیت 15 میں فرمایا گیا:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿١٥﴾

"(اے نبی ﷺ) آپ اسی (اقامتِ دین) کی دعوت دیتے رہیں اور ڈٹے رہیں جیسا کہ آپ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے اور ان (کفار) کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور (ان سے صاف صاف) کہہ دیں کہ میں ایمان لایا ہوں اُس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل (کا نظام قائم) کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان (اس بات پر) کسی حجت (دلیل بازی اور جھگڑے) کی ضرورت نہیں۔ اللہ ایک دن ہم سب کو (میدانِ حشر میں) جمع فرما دے گا اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

اس آیت کے مضامین کو سمجھنے کے لئے اُس پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے جس میں سورہ شوریٰ

نازل ہوئی۔ یہ سورہ مبارکہ مکی دور کے وسط کی سورتوں میں سے ایک ہے۔ اِس زمانے میں سردارانِ قریش کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم وتشدد کا بازار بھرپور طریقہ سے گرم تھا۔ مکی دور کے ابتدائی تین برسوں میں دشمنانِ اسلام کی مخالفت زبانی کلامی تھی اور انہوں نے اپنے طنز اور مذاق کا ہدف نبی اکرم ﷺ کی ذات کو بنائے رکھا تا کہ آپ کا حوصلہ پست ہو جائے، آپ کی کمرِ ہمت ٹوٹ جائے اور آپ اپنے مشن کو ترک کردیں۔ آپ ﷺ صبر واستقامت کا پہاڑ تھے لہٰذا آپ ثابت قدمی سے اور انفرادی رابطوں کے ذریعہ لوگوں تک پیغامِ حق پہنچاتے رہے۔ اِس کے نتیجہ میں نوجوانوں اور غلاموں کی ایک بڑی تعداد ایمان لے آئی۔ نبوت کے چوتھے برس آپ ﷺ نے علی الاعلان دین کی دعوت دینا شروع کی تو کفار نے محسوس کیا کہ یہ دعوت تو ایک بہت بڑے چیلنج کی شکل اختیار کر گئی ہے، "نظامِ کہنہ کے پاسبانو، یہ معرضِ انقلاب میں ہے"۔ تب اُن کے کان کھڑے ہوئے اور سوچنے لگے کہ اسلام کی یہ تحریک تو ایک ایسی تیز آندھی بن رہی ہے جو ہمارے اس نظام اور مفادات کو خاک کی طرح اڑا کر منتشر کر دے گی۔ یہیں سے وہ دور شروع ہوا جسے سیرت کی کتابوں میں "تَعْذِیْبُ الْمُسْلِمِیْنَ" یعنی مسلمانوں کی ایذا رسانی اور بہیمانہ تشدد (**persecution**) کا دور کہا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں یہ آیت نبی اکرم ﷺ کو استقامت کے ساتھ اپنی دعوت کا عمل جاری رکھنے کی ہدایت دے رہی ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ (آپؐ اسی (اقامتِ دین) کی دعوت دیتے رہیں اور ڈٹے رہیں جیسا کہ آپؐ کو حکم دیا گیا ہے) سے مراد یہ ہے کہ اے نبی ﷺ آپ اقامتِ دین کے عظیم مشن کو جاری رکھیں خواہ یہ مشرکین وکفار اسے برداشت کریں یا نہ کریں، خواہ گستاخیاں کریں، پتھر ماریں، ایذائیں پہنچائیں اور آپ ﷺ کی جان کے دشمن بن جائیں۔ "وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ" کے الفاظ میں اس بات کی مزید تاکید کی گئی کہ اِس مشن سے آپ ﷺ ایک انچ بھی نہ ہٹیں، کوئی دھمکی، تشدد، مصلحت، لالچ اور سودے بازی کی پیشکش آپ ﷺ کو متاثر نہ کرے۔

مصالحانہ رویہ کی ممانعت :

آیت زیر درس کا اگلا حصہ ہے : وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (اور اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے)۔ اس حصہ میں نبی اکرم ﷺ کو مشرکین کی طرف سے لالچ اور مصالحت کی پیشکش قبول نہ کرنے کی تلقین کی جارہی ہے۔ مکی دور میں ۴ اور ۵ نبوی کے دوران مشرکین نے نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیے۔

حضرت بلالؓ کو تپتی دھوپ میں مکہ کی سنگلاخ زمین پر منہ کے بل گھسیٹا جاتا تھا، لیکن اُن کی زبان پر کسی فریاد کے بجائے بس احد، احد کا کلمہ جاری رہتا۔ حضرت خبابؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا اور سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، اُن کے گوشت کے جلنے اور چربی کے پگھلنے سے انگارے ٹھنڈے ہوتے۔ حضرت یاسرؓ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں چار سرکش اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انہیں مخالف سمتوں میں دوڑایا گیا جس سے آپؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سمیہؓ کو ابوجہل نے بے دردی سے شہید کر ڈالا۔ حضرت عثمان غنیؓ کا چچا اُن کو چٹائی میں لپیٹ کر اندر دھواں چھوڑ دیتا جس سے دم گھٹنے کے قریب ہو جاتا۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کو بغیر لباس کے گھر سے نکال دیا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس قدر مارا گیا کہ آپؓ بیہوش ہو گئے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے تمام ساتھی راہِ حق میں ڈٹے رہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

آخر کار سردارانِ قریش نے محسوس کر لیا کہ اس دعوت کو ظلم وتشدد کے ذریعہ سے دبانا ممکن نہیں ہے۔ اب انہوں نے فیصلہ کیا کہ نبی کریم ﷺ سے مصالحت کے لئے بات چیت کرنی چاہیئے۔ تشدد سے تو بات نہیں بنی، ممکن ہے کہ لالچ سے بن جائے۔ لہٰذا آپ ﷺ کو مال ودولت کے ڈھیر دینے، مکہ کی خوبصورت ترین خاتون سے شادی کرا دینے اور مکہ کا بادشاہ تسلیم کرنے کی پیشکش کی گئی۔ اُنہوں نے مزید پیش کش کی آپ ﷺ جس طرح نماز پڑھنا چاہیں اور اپنے معبود کی عبادت کرنا چاہیں، ہم رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ ان تمام پیشکشوں کے عوض ہم

بس اتنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہمارے آبائی دین، ہمارے بتوں اور مشرکانہ نظام کی نفی کرنا ترک کر دیں۔

ان تمام پیشکشوں کے جواب میں نبی اکرم ﷺ کو ہدایت دی گئی وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے)۔لہٰذا آپ ﷺ نے سردارانِ قریش کو جواب دیا کہ "اگر تم میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو، تب بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آسکتا......یا تو میں اس دعوت کی تبلیغ میں اپنی جان دے دوں گا یا اللہ اس دعوت کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے گا!"۔

اس کے بعد سردارانِ قریش نے آپ ﷺ کو کچھ لینے اور دینے (Give & Take) کی پیشکش کی اور کہا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا کر) لے آیئے یا اس کو بدل دیجئے)۔ اس قرآن کا موقف انتہائی سخت ہے اور یہ ہمارے معبودوں کی کامل نفی کرتا ہے۔لہٰذا آپ قرآن میں تبدیلی اور لچک پیدا کیجئے یا پھر دوسرا قرآن پیش کیجئے۔جواب میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (مجھے اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں میں تو اُسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف نازل ہوتا ہے)۔اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

اس شعر میں بڑی حکیمانہ بات بیان کی گئی ہے۔باطل کا وجود اپنے بل پر قائم رہ ہی نہیں سکتا لہٰذا وہ مجبور ہوتا ہے کہ وہ خود کو قائم رکھنے کے لئے حق کا کوئی سہارا لے۔اس کے برعکس حق بذاتِ خود کھڑا ہوتا ہے اور اُسے باطل سے کسی سمجھوتہ کی ضرورت نہیں۔

ایمان بالکتاب:

اس کے بعد سورۂ شوریٰ کی آیت 15 میں فرمایا گیا وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ

(اور کہہ دیجئے کہ میں ایمان لایا ہوں اُس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی ہے)۔آیتِ کریمہ کے اس حصہ میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ اعلان فرما دیجئے کہ میں ہر آسمانی کتاب پر ایمان رکھتا ہوں۔گویا آپ ﷺ کا معاملہ اُن لوگوں کا سا نہیں جو تفرقہ میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔تمام آسمانی کتب اور صحیفے دراصل ایک کتابِ ہدایت کے مختلف ایڈیشن ہیں۔پہلی کتابیں بھی حق تھیں لیکن وہ محفوظ نہ رہیں۔اب ہدایتِ ربانی کا آخری اور کامل ایڈیشن یہ قرآنِ حکیم ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود لیا ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایمان بالکتاب کے اعلان کا حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مشرکینِ مکہ نبی کریم ﷺ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ آپ ﷺ اِس قرآن کو بدل دیں یا کوئی دوسرا قرآن پیش کریں۔اِسی کے جواب میں آپ ﷺ سے کہلوایا گیا کہ میں تو اُس کتاب پر ایمان رکھتا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے۔اگر میں یہ باتیں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوتا تو مجھے اس میں تبدیلی کا اختیار بھی ہوتا۔میں تو قرآن کا ایک شوشہ تک بدلنے کا مجاز نہیں ہوں، میں خود اس کا پابند ہوں جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے۔

نظامِ عدل کا قیام:

سورہ شوریٰ آیت **15** کے اگلے حصہ میں فرمایا گیا وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں)۔آیت کے اِس حصہ سے ظاہر ہوا کہ نبی کریم ﷺ محض واعظ اور مبلغ بن کر نہیں آئے بلکہ اُن کا مشن ہے کہ اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل قائم فرمائیں۔یہی حقیقت سورہ توبہ آیت **33**، سورہ فتح آیت **28** اور سورہ صف آیت **9** میں اس طرح واضح کی گئی کہ:

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

”وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ؐ کو کامل ہدایت کے ساتھ اور سچے دین

کے ساتھ تا کہ وہ اس کو غالب کر دیں کل نظامِ زندگی پر۔"

یہ آیت واضح کر رہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا مشن محض وعظ و نصیحت اور درس و تدریس نہ تھا۔ آپ ﷺ کا مشن انقلابی تھا، جس کا مقصد نظامِ باطل کو جڑ سے اکھاڑنا اور اس کی جگہ نظامِ عدل کو قائم فرمانا تھا۔ آپ ﷺ نے محض تبلیغ اور تزکیہ و تربیت کا عمل ہی نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کو میدان میں لا کر باطل سے بھی ٹکر لیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک ایک مثالی نظامِ عدل قائم فرما دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ ذمہ داری اُمت کے سپرد فرما دی۔ آج ہم نے کتاب اللہ سے رہنمائی اور ہدایت طلب کرنا چھوڑ دی، اسے صرف حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بنالیا اور اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر احتراماً طاقوں کی زینت بنادیا۔ لہٰذا ہماری اکثریت اُس اعلیٰ مقصد ہی کو فراموش کر بیٹھی جو مقصد تھا نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اور اب وہ ہماری ذمہ داری ہے۔

نظامِ عدل کیا ہے:

نظامِ عدل دراصل عقیدۂ توحید ہی کا عملی مظہر ہے۔ اس میں سیاسی اعتبار سے حاکم صرف اللہ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ بندوں کے لئے حاکمیت نہیں بلکہ خلافت کا تصور ہوتا ہے۔ گویا انسانوں کو انسان غلام نہیں بنا سکتے۔ معاشی اعتبار سے مالک صرف اللہ ہے۔ بندوں کے لئے ملکیت نہیں بلکہ امانت کا تصور ہوتا ہے۔ جاگیردار اور سرمایہ دار غریبوں کا خون نہیں نچوڑ سکتے۔ معاشرتی اعتبار سے خالق اللہ ہے لہٰذا تمام بندے اُسی کی مخلوق ہونے کی وجہ سے برابر قرار پاتے ہیں اور ہر اک کی جان، مال اور آبرو یکساں محترم تصور کی جاتی ہے۔

ذاتی محاسبہ کی دعوت:

سورۂ شوریٰ آیت 15 کے آخری حصہ میں فرمایا:

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

"اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان (اس بات پر) کسی حجت (دلیل بازی اور جھگڑے) کی ضرورت نہیں۔ اللہ ایک دن ہم سب کو (میدانِ حشر میں) جمع فرمادے گا اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

آیت کے اِس حصہ میں نبی اکرم ﷺ کو ہدایت کی جارہی ہے کہ آپ ﷺ اقامتِ دین کے مشن کی مخالفت کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ میں جو کچھ پیش کررہا ہوں وہ حق سمجھ کر پیش کررہا ہوں اور میں جو کچھ کررہا ہوں اسے اپنا فرض سمجھ کر کررہا ہوں۔ اِس کی جزا اپنے رب سے پاؤں گا۔ تم جو کچھ کررہے ہو اِس کے بارے میں خود غور کرو اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ اگر یہ نفس پرستی ہے اور بددیانتی ہے تو اِس کی جوابدہی تم کو کرنا ہوگی۔ ہمارے تمہارے درمیان حجت بازی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ روزِ قیامت ہم سب کو اللہ جمع فرما کر فیصلہ کردے گا کہ کس کی کیا ذمہ داری تھی اور اُس نے بالفعل کیا کیا؟

حرفِ آخر:

روزِ قیامت اگر ہم رسوائی اور عذاب سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں سورۂ صف آیات **10 - 11** میں بیان شدہ اِس ہدایتِ ربانی پر عمل کرنا ہوگا کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں بچالے دردناک عذاب سے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جان لو"

تنظیمِ اسلامی کے ساتھ تعاون کی صورتیں

پہلا درجہ:

قرآنِ حکیم کے تقاضوں کی ادائیگی کے لئے تنظیمِ اسلامی کے رفیق بنیے اور مال و جان سے دینِ اسلام کی خدمت کی سعادت حاصل کیجئے۔

دوسرا درجہ:

تنظیمِ اسلامی کے معاون ادارے انجمن خدام القرآن کے رکن بنیے اور اس کے مختلف منصوبوں کے لئے مالی تعاون فرمائیے۔اس ادارے کے تحت ہونے والے دروسِ قرآن، خطابات اور کورسز میں شرکت کیجئے تاکہ قرآنِ حکیم کے تقاضوں کا گہرا شعور حاصل ہو اور آپ غلبۂ دین کی جدوجہد کے لئے تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے بارے میں فیصلہ کرسکیں۔

تیسرا درجہ:

تنظیمِ اسلامی کے فکر اور طریقہ کار کو سمجھنے کے لئے، تنظیمِ اسلامی کے تحت ہونے والے دعوتی و تربیتی پروگراموں میں شرکت کیجئے۔

چوتھا درجہ:

دعا کیجئے کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ رفقائے تنظیمِ اسلامی کو ہدایت کی نعمت سے نوازے، ہر گمراہی سے محفوظ فرمائے اور خلوص و اخلاص کے ساتھ سنتِ نبویؐ پر عمل کرتے ہوئے دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔